دِلّی کی آخری شمع-ش ح ح

حافظ صفوان محمد چوہان*

Abstract

This research papers deals with the contribution of Sham-ul-Haq Haqi, a renowned scholar of Urdu. He has contributed in the field of Lexicography. He has been associated with Urdu Lughat Board, Karachi on various positions. He has compiled two important dictionaries Farhange-e-Talaffuz and English-Urdu dictionary respectively published by National Language Authority, Islamabad and Oxford University Press, Karachi. He was a good poet and critic also. This paper carries his whole contribution in the field of literature.

منگل ۱۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء شام ساڑھے چھے بجے محترم شایان الحق حقی صاحب نے موبائل فون پر سندیسہ بھیجا کہ اُن کے والد جنابِ شان الحق حقی وفات پا گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ میرا حقی صاحب سے پہلا باقاعدہ رابطہ ایک خط کے ذریعے سے مارچ ۱۹۹۱ء میں ہوا؛ اور طالب علمانہ نیازمندی کا یہ محبت بھرا سلسلہ اُن کی وفات پر ختم ہوا۔ پچھلے لگ بھگ دس مہینوں میں اُنھوں نے مجھے ڈیڑھ سو سے کچھ اوپر برقیاتی ڈاک (email) بھیجی اور تقریباً روزانہ ہی اُن سے انٹرنیٹ پر گپ شپ (chatting) کا موقع ملا۔ اِس عرصے میں اُن سے فون پر بھی بار بار بات ہوتی رہی ہے۔ برقیاتی خطوط کی آرک جارک تو انگریزی ہی میں رہی جب کہ انٹرنیٹ پر گپ شپ انگریزی کے علاوہ چند جملوں کی حد تک کبھی کبھی رومن اردو میں بھی ہوئی؛ اِس لیے اُن کی وہ منتخب باتیں جن کا ملخّص میں اِس مضمون میں پیش کر رہا ہوں، واوین کے بجائے اپنے الفاظ میں لکھی گئی ہیں۔

مجھے اللہ کی طرف سے اُن کی زندگی کے آخری دور میں اُن سے سب سے زیادہ رابطے میں رہنے کا نایاب تحفہ حاصل ہے، البتہ اُن سے بالمشافہہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہے۔

(حافظ صفوان محمد چوہان)

علامہ محمد اقبالؒ نے سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں لکھا ہے: ''..... میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اِس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں..... نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست'' اور ایک جگہ پر لکھا ہے: ''..... مجھے قطعاً یہ خواہش نہیں کہ دورِ حاضر کے شعرا میں میرا

* ڈویژنل انجینئر/سینئر لیکچرر (کمپیوٹر اینڈ ڈیٹا سروسز)، منیجر ڈیٹا نیٹ ورک، ٹیلی کمیونیکیشن سٹاف کالج، ہری پور

شمار بھی ہو.....'' اِنھی سے ملتا جلتا ایک اِقتباس مجھے جنابِ شان الحق حقی کا ملا ہے۔ لکھتے ہیں: ''.....میں نے ادب کو کیریر نہیں بنایا۔ اوقاتِ زندگی دوسرے ہی کاموں میں بسر ہوے ہیں، خصوصاً دفتری کام جو بالکل غیر ادبی نوعیت کے رہے ہیں..... میں نے صرف وہی بات کہی ہے جو کہنے کے قابل معلوم ہوئی۔ صرف کاغذ سیاہ کرنے کی ضرورت نہ تھی.....''

اِن دو اقتباسات میں سے پہلا اُس عظیم شاعر و فلسفی کا ہے جس نے محبوب کی کمر کی تلاش و پیمائش میں سرگرداں اردو و فارسی شاعری کو حجازی لَے اور شعائرِ اسلامی کے جمیل تر اور جلیل تر تصوراتی پیکروں کا ایسا متبادل نگارخانہ دیا جس سے شاعری کے مروَّجہ اسالیبِ بیان کی صدیوں پر محیط پوری روایت بوسیدہ و فرسودہ ہوگئی اور مشرقی شعری روایت کو نیا system of reference مل گیا، اور شاعری ایک پیغام اور تحریک کی مرادف ہوئی۔ فلسفے میں اِس عبقری نے اسلام کے الٰہی تصورات کو ٹھیٹ عقلی بنیادوں پر انسانوں کے گھڑے ہوے فلسفیانہ بتوں کی چمک دمک کے مقابلے میں لاثانی و لافانی انوارات کا منبع ثابت کیا، اور اِس سارے کام میں نہ تو اُس کا لہجہ کبھی معذِرت خواہانہ ہوا اور نہ کہیں اُس کے دلائل پادَر ہوا ہوے۔

دوسرا اِقتباس زندگی بھر سر جھکا کر ادبی، لسانی اور لغوی کاموں میں لگے رہے ایسے رجلِ رشید کی ایک کتاب کے دیباچے سے لیا گیا ہے جو نہ صرف اپنے عہد بلکہ کسی بھی عہد کے بڑے سے بڑے وابستہ بہ ادب عبقری سے کئی ایک لحاظ سے ترجیح دِیے جانے کا بجا طور پر لائق ہے۔

حقی صاحب نے اپنے ربع صدی قبل لکھے گئے ایک مضمون میں محتاط اہلِ زبان سے متعلق لکھا ہے کہ اُن کی تعداد اب اِتنی رہ گئی ہے جنھیں اب انگلیوں پر بھی گننے کی ضرورت نہیں ہے، جب کہ خود حقی صاحب کے بارے میں لفظوں کا مسیحا اور دِلّی کی آخری شمع کے الفاظ مرحوم مشفق خواجہ صاحب نے آج سے دس سال قبل استعمال کیے تھے۔ اِس مضمون کے عنوان کے لیے میں نے یہی الفاظ مستعار لیے ہیں۔ حقی صاحب دِلّی کی وہ آخری شمع تھے جو علم و ادب کے نگارخانے میں تقریباً پون صدی تک فروزاں رہی اور ایک مختصر مدت تک جھلملانے کے بعد اب خاموش ہوگئی ہے۔

تفنّنِ طبع کے لیے عرض ہے کہ حقی صاحب نے اپنے بارے میں ادب کو کیریر نہ بنانے کا جو جملہ استعمال کیا ہے اُس میں اِس لفظ کے ہجا career ہیں۔ اِس وضاحت کی ضرورت اِس لیے پڑی ہے کہ آثارِ علم کے بہت سے carriers آج کل اِس carrying ہی کو career بنائے ہوے ہیں۔

زبان کے بارے میں حقی صاحب کے خیالات بہت ہوش مندانہ ہیں۔ایک جگہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ کوئی بچہ اپنی مادری زبان کے سہارے زندگی نہیں گزارتا،اورلڑکوں کی بولی تو عین طفلی ہی میں ماں کی بولی سے مختلف ہوجاتی ہے۔زنانہ اور مردانہ بولی میں واضح امتیاز، پورے طرزِ کلام پر حاوی رہتا ہے۔زندگی کے مختلف شعبوں میں عورتیں جس قدر مردوں کے دوش بدوش آتی جائیں گی، یہ امتیاز کم سے کم ہوتا چلا جائے گا۔

ایک بار اُنھوں نے بتایا کہ اُن کے نزدیک اب حالی کی وہ پیش گوئی کہ اردو کا گھر لاہور ہوجائے گا (یعنی غیر اہلِ زبان ہی اردو زبان کی ساخت پرداخت کے امین ہوجائیں گے) اب پوری ہوچکی ہے۔ایک جگہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ اردو کا مستقبل اب اُن لوگوں کے ساتھ وابستہ ہے جن کی یہ مادری زبان نہیں ہے۔اردو کا آئندہ معیار اِنھی غیر اہلِ زبان کے مذاق واستعمال سے متعین ہوگا،اور یہ کہ عن قریب وہ اِسے کھینچ کر اپنے ڈھرے پر لے آئیں گے۔ایک اور جگہ پر اُنھوں نے لکھا ہے کہ جہاں تک گِنے چُنے اہلِ زبان کا تعلق ہے،اُن کی اولاد اردو سے اُتنی ہی دور یا قریب ہے جتنے کہ مقامی لوگ یا اُن کے بچے۔حق یہ ہے کہ اِس دور میں مقامی لوگوں نے اردو کا جتنا دامن بھرا ہے،اُتنا اہلِ زبان کا مقدور نہ تھا۔اِسی طرح ایک جگہ لکھا ہے کہ ہم لوگ اردو کے خادم ہیں مگر ہماری دعا ہے کہ خدا ہم کو ''زبان پرستی'' کے عذاب سے بچائے۔یہ خدا کے بندوں کا شیوہ نہیں۔یہ نہ انسان کی خدمت ہے نہ زبان کی۔وہ مظفر علی سید صاحب کا یہ قول اکثر دوہرایا کرتے تھے کہ اہلِ زبان اصل میں کہتے ہی اُسے ہیں جو زبان کا اہل ہو۔

آمدِ سخن کے طور پر ایک بات عرض کرتا ہوں کہ اوپر حالی کے جن الفاظ سے اقتباس کیا گیا ہے اُس میں حالی کا اِصرار لاہور پر نہیں ہے۔اگر اُن کا پورا اِقتباس پڑھا جائے (میرے سامنے اِس وقت ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کا مجموعۂ کلام امکان رکھا ہے؛ص۱۲) تو معلوم ہوگا کہ اُن کا اشارہ اردو زبان کے اپنے پنگوڑوں اور ٹھیّوں سے نکل کر وہاں وہاں تک جا پہنچنے کی طرف ہے جہاں جہاں کے لوگ اِسے برتتے اور استعمال کرتے ہوں:

> جو لوگ پنجابی اردو پر نکتہ چینی کرتے ہیں اُنھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اردو زبان اُن کے ہاتھوں سے نکل کر پنجاب میں جارہی ہے۔اگر یہی سلسلہ مدت تک جاری رہا تو جس طرح عربی زبان عرب سے نکل کر مصر اور شام میں چلی گئی،یقیناً وہ وقت دور نہیں ہے کہ دِلّی اور لکھنؤ کی بجائے لاہور اردو کا گھر ہوجائے گا.....

ایک صدی قبل کے حالی نے تو اردو کو اپنے زمانے میں صرف پنجابی بولنے والوں کے ہاں استعمال میں آتا دیکھا تھا۔

آج اردو زبان سرحد اور اُس کے قبائلی علاقوں اور بلوچستان کے کناروں کے ساتھ ساتھ سرائیکی اور ریاست بہاول پور کی ریاستی زبانوں والے علاقوں میں بھی رابطے کی زبان کے طور پر استعمال میں ہے۔ مجھے پورے پاکستان میں مختلف بولیاں بولنے والے ایسے بہت سے خاندانوں کا علم ہے جنھوں نے اپنی اپنی مادری بولیوں کو چھوڑ کر اردو کو اختیار کر لیا ہے۔ اردو، جس کی اُفتاد ہی عوامی ہے، کو اِن مقامی لوگوں نے اِتنی اچھی طرح اپنا لیا ہے کہ اہلِ زبان بھی رشک کریں۔ یہ مقامی زبانوں کی ہم رشتہ ہے اور اِس کی ترکیبِ نحوی ایسی نادر ہے کہ ہر زبان کا لفظ اِس میں کھپ جاتا ہے، اور بخلاف انگریزی کے، اِن سب زبانوں میں علی العموم جملے کی ترکیب ایک طرح کی ہے: لفظ کی جگہ لفظ رکھ دیجیے، جملہ تیار ہے۔ یوں حقی صاحب کے نزدیک اردو کو زیادہ خطرہ نادان دوستوں سے تھا، اِس لیے وہ انھی کی بوالعجبیوں سے زبان کو بچاتے رہے۔ (بلکہ ایک بار تو اُنھوں نے ایک بڑی ہی مزے دار کہاوت بھی سنائی کہ یہ لوگ جڑ کاٹے جاتے ہیں، پانی دِیے جاتے ہیں۔) مجھے اُن کے لسانی موضوعات پر لکھے گئے تمام مضامین حالی کے اِسی ایک اقتباس کے گرد طواف کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

حقی صاحب کا یہ جملہ کہ ''لفظ کا چلن اُس کے فصیح تلفظ پر حاوی ہو جاتا ہے،'' میرے نزدیک ایک ضرب المثل ہے۔ اُن کا ایک شعر ع دنیا ہی کی راہ پہ آخر رفتہ رفتہ آنا ہوگا اِس بات کو بھی مشیر ہے۔

ایک بار میں نے اُن سے دریافت کیا کہ جب اربابِ اقتدار اردو کے بارے میں سنجیدہ اور اِس نفاذ کے لیے مخلص تھے تو اُس وقت یہ کام کیوں نہ ہو پایا، اور ہنوز روزِ اوّل کیوں ہے؟ جواب ملا کہ جب اربابِ اقتدار اِس کام کے لیے آمادہ تھے اُس وقت میں اِلّا دُکّا کے سوا اردو کے سب ہی بڑے بڑے نام اِس فرض کو چھوڑ کر نفلوں اور مستحبات کی بحثوں میں اُلجھے ہوے تھے۔ قابلِ عمل تجاویز بہت کم تھیں۔ میں نے رائے دی تھی کہ اردو کے ساتھ ساتھ جہاں ضرورت ہو، رومن سے بھی کام لینا لازم ہے؛ اردو کو فوری طور پر سرکار اور کاروبار میں رائج کرنے کی یہی ایک عملی صورت ہے۔ کوئی یہ اعتراض نہ کر سکے گا کہ اردو کے لیے ایک دم لاکھوں ٹائپ رائٹرز اور ٹائپ نویس کہاں سے لائے جائیں، اور اب انگریزی کے لیے استعمال ہونے والے بے شمار ٹائپ رائٹرز ایک دم کیسے بدل دیے جائیں۔ اِس طرح نہ تو حکومت پر بوجھ پڑے گا اور نہ عوام کے لیے یہ تبدیلی ایک بلاے ناگہانی بنے گی۔ میں نے نتیجے کی بابت دریافت کیا تو اُنھوں نے بہت افسوس سے بتایا کہ اِس تجویز کے بعد مجھ پر رومن اردو کا حمایتی ہونے کا الزام چسپاں کیا گیا۔ یوں بے جا نزاکتوں میں جا پڑنے اور ناقابلِ عمل تجاویز کا انبار لگ جانے کی وجہ سے اردو پاکستان کی سرکاری زبان نہ بن سکی اور لوہے کے گرم ہونے کا فائدہ نہ اُٹھایا جا سکا۔ اور اب تو کوئی امید بھی نہیں رہی۔

یہاں تک کہ اربابِ اقتدار کے آج کل زبان کے بارے میں رویے سے دل برداشتہ ہوکر ایک بار اُنھوں نے مجھے لکھا کہ وہ کم سے کم پاکستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں بالکل مایوس ہو چکے ہیں، اور یہ کہ اردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ یہ بات کہتے ہوے اُن کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔

رومن اردو دراصل اُن لوگوں کی بنیادی ضرورت ہے جو مدتوں سے انگریزی بولنے والے ملکوں میں آباد ہیں اور اُن کے بچے اب اردو بول تو سکتے ہیں، پڑھ یا لکھ نہیں سکتے۔ حقی صاحب مغربی ماحول سے گہری آشنائی کی وجہ کر اِس ضرورت سے آگاہ تھے۔ آج انٹرنیٹ پر اردو کے اخبارات کا رومن اردو ایڈیشن ساتھ میں نکلنا اِس بات کی شہادت ہے کہ وہ آج سے پچاس سال پہلے اِس کی ضرورت کو محسوس کر چکے تھے۔ مزید برآں، میں یہ اندازہ کرنے میں بھی کسی بدعقیدگی یا کٹھ ملائیت کا شکار نہیں ہوں کہ حقی صاحب کی اِس تجویز کہ اردو کتابوں اور رسالوں وغیرہ کی اشاعت خطِ نسخ میں بھی ہونی چاہیے، کی ترویج اب بارہ پتھر دور کی بات نہیں رہی۔ متحدہ عرب اِمارات وغیرہ میں تو یہ سلسلہ شروع بھی ہو چکا ہے۔ یہاں یہ اعتراف ضروری ہے کہ کمپیوٹر پر ''نوری نستعلیق'' جیسی دیدہ زیب لکھاوٹ احمد مرزا جمیل صاحب کی دین ہے جس پر دنیاے اردو اُن کی ہمیشہ احسان مند رہے گی، کہ اِس نے اردو کو عہدِ جدید کی رفتار عطا کر دی ہے۔

ایک بار میں نے حقی صاحب سے عرض کیا کہ تبلیغ والے پوری دنیا میں جہاں بھی جاتے ہیں، اردو ہی میں بات کرتے ہیں۔ بلکہ بیرونی ممالک کے جو لوگ پاکستان میں وقت لگانے کے لیے آتے ہیں وہ تبلیغ کا بنیادی نصاب (''چھے نمبر''، عمومی اور خصوصی ملاقاتوں میں کی جانے والی گفتگو، عمومی بیان، روزمرہ زندگی کے مختلف اعمال کے آداب، وغیرہ) اپنی زبان کے ساتھ ساتھ، سادہ اور خالص اردو میں از خود ہی سیکھ لیتے ہیں۔ بیرونی ممالک کے جو طالبِ علم مدرسوں میں پڑھتے ہیں اُن کے لیے روزمرہ کی گفتگو صرف اردو ہی میں کرنا لازم ہے۔ اِس طرح عرب ممالک کے ساتھ ساتھ فلپائن، انڈونیشیا، ملائشیا، حتیٰ کہ روسی ریاستوں، افریقہ کے سب ممالک، آسٹریلیا، برازیل، فن لینڈ، چین، جاپان، ترکی اور ایران وغیرہ کے لوگ اردو سیکھ کر جاتے ہیں اور اِن ممالک کے اندر اِن کے اپنے بچے، جو پاکستان میں آکر عالم بنے، وعظ و نصیحت کے علاوہ درسِ قرآن اور دینی تعلیم بھی اردو میں دے رہے ہیں۔ میں نے حقی صاحب کو بتایا کہ کس طرح ایک بار ایک جماعت میں میں نے تھائی لینڈ اور ملائشیا کے طالب علموں کو تبلیغ کی متذکرۂ بالا مبادیات تھائی اور ملائی رسوم الخط میں اِملا کرائی تھیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ یہ تو ایک خبر ہے کہ اردو کو تھائی اور ملائی ابجد میں لکھا گیا، اور اِس سے ایک نیا عالمی منظر نامہ سامنے آتا ہے؛ اور پھر بہت دیر تک مجھے اردو کے

لیے مخصوص طبقے اور محدود پیمانے پر رومن رسم الخط کی اِجازت ہونے اور اِسے ناک کا مسئلہ نہ بنانے کی بابت بتاتے رہے کہ اِس سے دراصل اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بڑھے گی۔ کسی بھی زبان کے رسم الخط میں جب اردو لکھی جائے گی، اُس زبان و ثقافت سے ہمارا رشتہ مضبوط ہوگا۔ سید ذوالکفل بخاری کے بقول تبلیغی محنت ایک سراسر مثبت اور نہایت مثمر کام ہے کیوں کہ یہ اپنی اصل میں خیر اور خلوص پر مبنی ہے؛ حقی صاحب تبلیغی محنت کے اِن ثمرات کی بدولت اردو زبان کے لیے تبلیغ والوں کی اِس ''خاموش خدمت'' کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے تھے اور اِس کام کے عالم گیر پھیلاؤ کا بہت ہی اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا کرتے تھے۔

حقی صاحب نے لکھا ہے کہ اردو کی اصنافِ سخن اتنی گوناگوں ہیں کہ شاید ہی کسی اور زبان میں ہوں گی۔ انگریزی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا، فارسی میں بھی قطعہ، رباعی، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد سے لے کر بہت کچھ سہی، دوہا کہاں ہے؟ پھر اردو نے سونٹ اور کینٹو سے لے کر جاپانی ہائیکو تک کو اَن چھوا نہیں رکھا، اور بعض مقامی زبانوں کی اصناف کو بھی لے لیا: بولیاں، نمکئی وغیرہ۔ مرثیہ اپنی مخصوص ہیئت (مسدس کی صورت) میں اردو ہی کی چیز ہے۔ اِس زبان کے اِتنے روپ اور اِتنے رنگ ہیں کہ اصناف کہیں ہیئت پر مبنی ہیں، کہیں موضوع پر، کہیں لہجے اور لغت پر۔ گیت، شادیانے، ریختی، جھولا، لوری، پنکھا، سہرا تک ایک لمبا سلسلہ ہے، خواہ متروک سہی۔ مگر اِن کے نمونے موجود ہیں اور اِن کا ذکر ادب میں آتا ہے۔

اردو اِملا کے بارے میں حقی صاحب روایت کی پاس داری کے ساتھ ایک حد تک رواداری برتنے کے بھی قائل تھے۔ وہ رشید حسن خاں صاحب کی علمیت کے بہت قدردان تھے لیکن اُن کے مجوزہ اِملا کو مکمل طور پر اختیار کر لینے کو ''اِنتہا پسندانہ'' گردانتے تھے، کہ اِس سے ''زبان کا حلیہ ہی بگڑ جائے گا، اور پڑھے لکھے لوگ بھی نیم خواندہ ہو جائیں گے۔'' اِس سلسلے میں اُنھوں نے مجھے Henry Bradley جو آکسفرڈ لغتِ کبیر کا دوسرا ایڈیٹر بنا (۱۸۸۸ء تا ۱۹۲۳ء)، کے زبان کے مسائل پر لکھے گئے کچھ لیکچرز اِرسال کیے اور Ludwig Wittgenstein کے خیالات سے آگاہ کیا، اور George Bernard Shaw کی انگریزی اِملا کی درستی کے لیے چلائی جانے والی تحریک اور اِس کی ناکامی کے وجوہات کے بارے میں بہت معلومات افزا باتیں بھی بتائیں۔ کمپیوٹر کے لفظ نگار سے گہری واقفیت اور تکنیکی ضرورتوں سے آگاہ ہونے کی وجہ سے وہ اُصولی طور پر اِملا کی معیار بندی (standardization) کے حامی تھے لیکن وہ اِس عمل کو بتدریج کرانا چاہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اِس بات کو اِبتدائی سکول کی سطح سے شروع کرایا جائے اور اساتذہ کی تربیت کرائی جائے؛ اور اِس کے لیے صرف اردو

زبان کے نہیں بلکہ جملہ علوم وفنون کے اساتذہ کی تربیت ضروری ہے، اور ساتھ ہی ساتھ بڑے اخبارات اور ٹیلی وژن کے کمپوزکاروں کی تربیت بھی۔ چوں کہ حقی صاحب اِملا کے معاملے میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کی تنہا رائے کو قابلِ عمل نہیں گردانتے تھے اِس لیے اُن کی اِس رائے کے احترام میں میں نے مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد کی سفارشات برائے اِملا ورموزِ اوقاف جو اُن لوگوں کی دماغ سوزی کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں جن سے ہماری آج کی اردو زبان کی آبرو قائم ہے، کو مقدور بھر اپنایا بھی ہے اور اپنی بساط بھر کوشش کر کے کئی ایک سکولوں اور اِشاعتی اِداروں میں جاری بھی کرایا ہے۔ حقی صاحب اِس سے بہت خوش تھے۔

حقی صاحب کے نزدیک اردو زبان اپنی بوقلمونی، برِعظیم پاک و ہند کے دوردراز علاقوں کی بولیوں اور تہذیب کے چاروں کھونٹ کے اثرات کے تحمل، عربی وفارسی جیسی اعلیٰ ادبی وثقافتی سرمایہ رکھنے والی زبانوں کا ایک طرح سے خرمن ہی لوٹ لینے اور دورِحاضر کی کئی شائستہ زبانوں کا جوہر اور عطر کھینچ لینے کی بے مثال اِکتسابی صلاحیت، بہترین نظام الاصوات اور اسالیبِ اظہار کی فراوانی کے سبب ایک زندہ وتوانا زبان ہے جس نے سیاسی و ذہنی محکومی کے سیاہ ترین دور میں اور چار چوٹ کی مار کھانے کے باوجود نہ صرف علمی وادبی تقاضے نبھاے بلکہ عملی زندگی کی عوامی ضروریات کو بھی پورا کیا۔ اُن کے دلائل کی روشنی میں اردو کا رسم الخط اپنی دیدہ زیبی، تکنیک اور مجرد حروف کے دائروں وغیرہ کو چھوڑ کر صرف جزوِلازم سے کام لے کر حروف کو باہم ملانے کے اُعجوبہ طریقے کی برکت سے بیک وقت کئی الفاظ کے حیطۂ نظر میں آسکنے کے سبب سے، ایک مثالی رسم الخط ہے۔

اُنھوں نے اپنے آکسفرڈ انگریزی-اردو لغت کے اِبتدائیے میں ایسے الفاظ کے لیے جو پہلے لغت میں کسی اصل اندراج کے تابعات/تحتی الفاظ ہوتے تھے لیکن اب اتنے وسیع المطالب ہو چکے ہیں کہ اب خود بھی اصل اِندراجات بن چکے ہیں، denesting کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا ظاہری مطلب پرندوں کے ایسے بچّوں کی آشیاں بدری ہے جو اپنی حفاظت، اُڑنے اور خوراک تلاش کرنے کے قابل ہو چکے ہوں۔ اِس لفظ کو استعمال کرتے ہوے میں حقی صاحب کے طویل ذہنی پُختہ وپَز کے نتیجے میں تشکیل پانے والے اِن افکار کی روشنی میں یہ عرض کروں گا کہ اُن سے پہلے اردو زبان nestlessness (بے آشیانی) کی کیفیت کا شکار تھی، جو اَب اُن کی جگر کاوی اور دماغ سوزی کے نتیجے میں denest (آشیاں بدر) ہو چکی ہے۔ ؎

خوش اَداؤں کے سخن ایک ہیں سارے حقّی
اِن کو یورپ میں بھی دِلّی کی زباں آتی ہے

حقی صاحب نے اردو کا مقدمہ نہایت دیانت داری، تیقّظ، اور سب سے بڑھ کر حقائق کو تسلیم کرتے ہوے تصنیف کیا ہے۔ اُنھوں نے زبانوں کے غیر چلن دار ہوجانے کے موضوع پر جتنی گہری تحقیق کر رکھی ہے اُس کی روشنی میں یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ وہ اُن سب روشوں اور شاہ راہوں سے بخوبی آشنا ہیں جو بند گلیوں تک لے جاتی ہیں اور جن پر چلتے چلے جانے کا نتیجہ زبان کی موت ہوا کرتا ہے۔ یوں اُنھوں نے زبان کے بارے میں ہمیشہ حقیقت پسندانہ باتیں لکھی ہیں۔ زبان پر ثقافتی تبدیلیوں کے اثرات کے ضمن میں وہ نوحہ گری اور مرثیہ خوانی کرنے کے بجاے بہت پراُمید ہیں کہ صرف وہی تبدیلیاں ٹھہر سکیں گی جن کا کوئی جواز ہوگا، لہٰذا اِن سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر دوسری زبانوں کے الفاظ کا داخلہ روکنے کے لیے اردو کی پشت پر تعصب یا بے تُکے پن کا ایسا چار جامہ کسا گیا جو زبان کے فطری پھیلاؤ کو روکتا ہو تو اردو کا مستقبل وہ ہوجاے گا جو لاطینی زبان کا حال ہے۔ ہر زبان کے الفاظ پر قانونِ بقائے اَنفع کا اِطلاق ہوتا ہے؛ اگر نئے الفاظ میں قبولِ عام اور ٹھہر جانے والی خوبیاں ہوئیں تو فبہا، اور اگر یہ نحیف ونزند ہوے تو بہتر الفاظ جلد اِن کی جگہ لے لیں گے۔ اردو کا مقدمہ لڑتے ہوے حقی صاحب کا موقف کبھی کمزور نہیں ہوا۔ اپنی اِس مؤکّلہ کا حق پر ہونا اُن پر کھلا ہوا تھا۔ زبان کی حمایت میں بولتے ہوے وہ کبھی دامن بدندان ہوے اور نہ کسی اور زبان کی ظاہر بظاہر خوبیوں یا پھیلاؤ سے مرعوب ہوے۔ زبان کے بیان میں کہنے کے لیے اُن کے پاس ہمیشہ وزنی باتیں رہیں۔

- ۲ -

اب آیئے حقی صاحب کے کلاں اردو لغت سے متعلق کیے ہوے کام کی طرف۔ حقی صاحب نے ترقیِ اردو بورڈ میں اپنے کام سے متعلق مجھے زیادہ نہیں بتایا۔ یہ فرمایا کہ میں اُن کی آپ بیتی افسانہ در افسانہ کسی وقت میں پڑھ ڈالوں تو بہت سے سوالات کے جواب مل جائیں گے۔ ایک بار مجھے لکھا کہ جب اُنھوں نے بورڈ چھوڑا، اُس وقت تک لغت کا مسودہ آخری حرف ی تک مکمل ہو چکا تھا۔ اسناد کے تقریباً تیرہ لاکھ کارڈ بنائے جا چکے تھے جن کا ایک بڑا حصہ خود اُن کا بنایا ہوا تھا۔ یہ کام پندرہ برس میں ہوا تھا۔ پریس لگوا کر طباعت شروع کرا دی گئی تھی اور پہلی جلد کے لیے کاغذ حاصل کر لیا گیا تھا۔ ہر چھٹے مہینے ایک جلد شائع کرنے کا پروگرام تھا، کہ صرف کارڈوں پر سے پریس کاپی ٹائپ کرانا تھی۔ اب پینتالیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں لیکن اِشاعت کا یہ کام ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔

کلاں اردو لغت کی تجمیع، تسوید وتشکیل (spadework) کا یہ کام (جسے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب

نے ''گیسوے اردو کی شانہ کاری'' کہا ہے) حقی صاحب نے سالہا سال لگا کر اور بغیر کسی معاوضے کے، اپنے شوق سے انجام دیا۔ اُن کی ملازمت پہلے وزارتِ اطلاعات ونشریات اور بعد ازاں پاکستان ٹیلی وژن میں تھی جب کہ لغت بورڈ میں کام کرنا اعزازی؛ یوں ایک دفتر کے کاموں سے نمٹ کر وہ دوسرے دفتر میں پہنچ جاتے اور رات گئے تک کام کرتے۔ اِس طرح رات دن کے مطالعے اور کارڈ بنانے میں لگے رہنے کی وجہ سے اردو نظم ونثر کے کل سرمائے کا معتدبہ حصہ اُن کی نظر سے گزر گیا۔ محترمہ سلمیٰ حقی کے نزدیک حقی صاحب نے مشاعرے پڑھنا بھی اِسی لغت پر قربان کر دیا، کہ اپنی غزل سنانے کی باری آنے میں جتنی دیر تک انتظار کی کھکھیڑ اُٹھانا پڑتی ہے اُس میں وہ ایک آدھ کتاب کو پڑھ کر اُس میں سے اِس لغت کے لیے اَسناد نکال سکتے اور کارڈ بنا سکتے ہیں۔ میں اِس پر یہ اضافہ کروں گا کہ اُنھوں نے اپنے بیوی بچوں اور ذاتی کاموں کے لیے ملنے والا وقت بھی اِسی لغت پر قربان کیا۔ اردو کے خوشہ چیں ہم سب لوگ اُن کے بچوں کے احسان مند ہیں کہ اُنھیں آغوشِ پدر کی گرمی کی قربانی دینا پڑی لیکن اُن کے والد کلاں اردو لغت کی شکل میں اردو زبان کو آغوشِ پدر دے کر دنیا کی وسیع ترین، مرتّب ذخیرۂ الفاظ رکھنے والی زبانوں کے ہمسر کر گئے۔

چاہیے تھا کہ حقی صاحب سے قدیمی تعلق رکھنے والے اور بالخصوص اردو کے کرتا دھرتا اِداروں سے منسلک، اِس امر کے جاننے والے لوگ اُن پر لکھے گئے تعزیتی شذرات میں ''عالمانہ لاعلمی'' سے کام نہ لیتے اور اِس کمر دوہری کر دینے والی بے مثال، بے لوث محنت کا محض تذکرہ ہی فرما دیتے، کہ یہ ایک محمود اخلاقی قدر ہے۔

اردو کی تمام تاریخ مستقل اِرتقا کی تاریخ ہے، اور یہ اِس کی برنائی کا ثبوت بھی ہے۔ ۱۹۰۳ء میں اقبال نے اپنے ایک مقالے اردو زبان پنجاب میں میں اردو کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ ابھی ''بن رہی'' ہے؛ کلاں اردو لغت اردو کے آغاز اور تشکیلی دور سے بھی اگلے پڑاؤ کے آثار کو اپنے اندر سموے ہوے ہے۔ اگر اِس لغت کے دائرۂ کار کو محدود نہ کر دیا گیا ہوتا، جیسا کہ بعد میں کر دیا گیا، تو یقین ہے کہ جیسے آکسفرڈ لغتِ کبیر (OED) کے بارے میں یہ رائے سامنے آئی تھی کہ اگر انگریزی کا سارا اَدب ضائع بھی ہو جائے تو صرف اِس لغت کی مدد سے اُسے دوبارہ وجود میں لایا جا سکتا ہے ویسے ہی اردو ادب کے ضمن یہی بات اِس لغت سے متعلق کہی جا سکتی تھی۔ یہ بات تلخ سہی لیکن حقیقت ہے کہ اِس عظیم لغت کے پہلے جلد میں اِس کا دائرۂ کار ''اردو کے تمام متداول، متروک، نادرالاستعمال، مفرد اور مرکب الفاظ، محاورات اور امثال'' بتایا گیا تھا اور اِسے پچھلے تقریباً سات سو پچاس سال سے زائد عرصے تک کے ذخیرۂ ادب کی مثالوں سے مزین کیا جانا بتایا گیا تھا۔ بہر حال بعد کی جلدوں میں یہ دائرۂ کار بتدریج سکیڑا جاتا

رہا، جس کی ایک وجہ قابل لوگوں کا کم ہوتے چلے جانا اور پھر قریب قریب نایاب ہوجانا بھی ہے۔ اِس سے بھی کڑوا بلکہ، ایک انگریزی محاورہ استعمال کرتے ہوے بات کی جاے تو، برہنہ سچ یہ ہے کہ اِس لغت کے لیے بنائے گئے اِن لاکھوں کارڈوں میں سے ہزارہا کو ضائع کیا گیا، بلکہ فی الواقع اِنھیں جلا کر آگ تاپی گئی۔ لغت پر کام کرنے والے لوگ جانتے ہیں کہ کارڈ کی کیا اہمیت ہوتی ہے، اور یہ بھی کہ کارڈ الگ چیز ہے اور اِس کا لغت میں اندراج الگ؛ ضروری نہیں ہے کہ ہر کارڈ کے مندرجات کو لغت میں شامل بھی کیا جاے۔ اگر کسی وجہ سے ایک کارڈ کے مندرجات شاملِ لغت نہیں کیے جارہے تو اُسے پھاڑ کر ضائع کر دینا بہت ہی بڑی قساوت ہے چاہے اِس کے لیے کوئی بھی وجہ گھڑ لی جاے۔ یوں یہ لغت اِس لحاظ سے بڑا بدقسمت بھی رہا ہے کہ اِس کی شروع کی جلدوں میں مندرجات کے ردّوقبول کا اِدارتی اختیار، اہلِ علم میں خالص علمی بنیاد پر پیدا ہونے والا قصہ پاک کرنے کے لیے، کارڈوں ہی کا قصہ پاک کرنے کی صورت میں استعمال کیا گیا۔ اردو زبان واقعی بڑی سخت جان ہے کہ ایسے آبرو کے لاگو ہوجانے والے مہربانوں کے درمیان میں بھی زندہ رہی ہے۔

حقی صاحب نے اردو لغت بورڈ کا مجلّہ سہ ماہی اردو نامہ بھی جاری کیا، تاکہ ''.....اپنے کام کی بابت اہل الرّاے سے اِستصواب کیا جاسکے، پبلک کے اطمینان کے لیے اپنی کارگزاری پیش کی جاسکے، اور جب یہ صورت ہوگی تو کام کرنے والوں کو بھی مستعد ہونا پڑے گا۔'' یہ واحد مجلّہ تھا جو علی العموم لسانیات سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۹۹۷ء میں اِس کا اِشاریہ بھی شائع ہوا ہے جسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بعد ازاں لسانیات کے موضوع پر جن لوگوں کی مستقل کتابیں شائع ہوئیں وہ سب اوّل اوّل اِسی جولان گاہ میں اشہبِ جہندہ سوار رہے۔ خود حقی صاحب کے لسانیات پر بہت سے مضامین اِبتداءً یہاں اِداریے کی شکل میں شائع ہوے تھے۔ ایک وقت آیا کہ اِس مجلّے میں کلاں اردو لغت کے مرتّب شدہ اجزا بھی قسط وار چھپنے لگے اور اِن پر آمدہ تبصرے بھی۔ اِس طرح اِس دور میں یہ لغت بڑوں کی مستقل نگرانی میں رہا اور اُن کی توجہات سے فیض پاتا رہا، اور یوں خبروں میں موجود (In) رہا۔ میں بہت افسوس کے ساتھ یہ جملہ تحریر کر رہا ہوں کہ آج تو اردو ادب کے بہت سے اساتذہ بھی ایسے ہیں جنھوں نے اِس لغت کو دیکھا تک نہیں ہے اور نہ ہی کسی ایسے کام کا اُنھیں علم ہے۔ چوں کہ اردو نامہ کے لیے کوئی علاحدہ گرانٹ منظور نہیں تھی اِس لیے یہ صرف اشتہارات پر چلتا تھا، جن کے لیے پیرا دوڑی بھی حقی صاحب خود ہی کیا کرتے تھے۔ اُن کے لغت بورڈ سے الگ ہوتے ہی یہ مجلّہ بھی بند ہوگیا۔ اردو نامہ کے کل ۵۴ شمارے (اگست ۱۹۶۰ء تا اپریل ۱۹۷۷ء) شائع ہوے۔

اِس بات کا ذکر یہاں بے محل نہیں ہوگا کہ لغتِ کبیر اردو کے نام سے بسیط اردو لغت پر کام سب سے پہلے

شان الحق حقی صاحب کے والد مولوی احتشام الدین حقی صاحب نے شروع کیا تھا اور آخری چند حروفِ تہجی کے سِوا سارے لغوی اِندراجات مکمل بھی کر لیے تھے، لیکن افسوس کہ اُن کی اچانک وفات (۱۹۴۵ء) کے سبب یہ کام اَدھورا رہ گیا اور اُن کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا۔ (۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۷ء میں البتہ اِس کا اِبتدائی کچھ حصہ انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان نے شائع کر دیا ہے۔) اِس کام کے لیے کئی اہلِ کمال یکے بعد دیگرے رکھے گئے تھے مگر یہ کام بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا گیا اور اندازہ ہوا کہ یہ کم وبیش چالیس جلدوں میں مکمل ہوگا۔ بالآخر مولوی احتشام الدین حقی صاحب کا انتخاب ہوا اور کام باقاعدہ چلنا شروع ہوا۔ اُنھوں نے اپنے ڈھنگ پر اِس کا منصوبہ گانٹھا۔ یوں اِس کام کے آغاز میں وہ اکیلے نہ تھے اور کئی لوگوں نے جزوقتی طور پر اُن کی معاونت بھی کی کیوں کہ اِس نوعیت کا کام اکیلا آدمی کر ہی نہیں سکتا، جب کہ اُن کا یہ شغل ہمہ وقتی تھا۔ یہ اُن کا سب سے بڑا علمی کارنامہ تھا جو اُنھوں نے نظامِ دکن کی مالی سرپرستی میں کم وبیش چودہ سال لگا کر کیا تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد یہ بے مثال علمی خزانہ ٹرکوں پر لاد کر دِلّی سے اردو کالج کراچی میں منتقل کیا گیا۔ اردو لغت بورڈ نے جو عظیم کام بالآخر اجتماعی کاوش سے کیا اور جس میں غالب حصہ شان الحق حقی صاحب کا ہے، مولوی احتشام الدین حقی صاحب کے مسودات سے تقابل کرنے سے علم ہوتا ہے کہ یہی کام وہ اوّل اوّل انفرادی طور پر کر رہے تھے۔ پاکستان میں بسیط اردو لغت، جسے یہاں پر کلاں اردو لغت لکھا جا رہا ہے تا کہ التباس نہ ہو، کا تاریخی نام محیطِ اردو تالیفِ پاکستان رکھا گیا تھا جسے سہولت کے لیے محیطِ اردو لکھا جانے لگا۔ بعدازاں یہ اردو لغت (تاریخی اصول پر) کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اِس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں سامنے آئی۔

سخن کوتاہ، بابائے اردو مولوی عبدالحق کی جوہر شناس نظروں نے مستقل اہمیت کے اِس کام کے لیے اپنے وقت کے سب سے موزوں عالمِ لسانیات کا انتخاب کیا۔ اردو زبان اِس انتخاب پر بابائے اردو کی، اِس کام پر مولوی احتشام الدین حقی کی، اور اِس عطا پر انجمنِ ترقیِ اردو کی ہمیشہ احسان مند رہے گی۔

کلاں اردو لغت اور حقی صاحب کے تعلق کے موضوع پر میں مزید کچھ لکھنے کے بجائے ہمارے قومی نگارخانے کے ایک نادر نقش جناب ممتاز حسن، جن کے ماتحتی میں وہ ترقیِ اردو بورڈ میں معتمدِ اعزازی طور پر کام کر رہے تھے، کے چند جملے نقل کرتا ہوں جو اُنھوں نے حقی صاحب کے آجر، مینجنگ ڈائریکٹر پاکستان ٹیلی وژن کو ستمبر ۱۹۷۰ء میں لکھے تھے:

.....What Haqqee does for you in Television is known to you and you are the best judge of his work, but I wish to say that quite apart from and in addition to his Television duties, what he does for me in the Urdu

Development Board, more as a hobby than anything else, is invaluable. He has been the Honorary Secretary of the Board for the last eleven years or so, and I cannot imagine that the Board could have done any of the important work entrusted to it if Haqqee had not been there to help at each step.....

دفتروں میں کام کرنے والے ملازمین اِس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ اِس طرح کی قدردانی اور دفتری کارگزاری کا ایسا احسان مندانہ اِعتراف (appreciation) شاید ہی کسی ملازم کو نصیب ہوتا ہے۔ ؎

وہ جس نے بنا کیں یہ زیاراتِ خوش آثار
ہے دفن کسی قطعۂ ہموار کے نیچے .....حقیؔ

☆

انجمنِ ترقیِ اردو کا انگریزی-اردو لغت جس کا نقشِ اوّل ۱۹۳۷ء میں سامنے آیا تھا، وہ بالآخر آکسفرڈ کے انگریزی-اردو لغت کی شکل میں شان الحق حقی صاحب کے ہاتھوں ۲۰۰۲ء میں اپنی موجودہ شکل میں مکمل ہوا۔

اِس جدید ترین، جامع اور منفرد لغت جو متداول انگریزی کا کامل احاطہ کرتا ہے، کے ماتھے کا جھومر وہ مثالی جملے ہیں جو متقابل اردو جملوں کے ساتھ درج کیے گئے ہیں جن سے لفظ و محاورے کا مفہوم آئینہ ہو جاتا ہے۔ نئے دور کے تازہ ترین موضوعات، علومِ جدیدہ اور تکنیکی شعبوں سے تعلق رکھنے والے نئے الفاظ اور اصطلاحات کی ایک وسیع تعداد بھی اِس لغت میں موجود ہے۔ محترمہ امینہ سید کے الفاظ میں، یہ کام اِداروں کے کرنے کا تھا جو صرف حقی صاحب کی مافوق البشر صلاحیتوں ہی کی بدولت پایۂ تکمیل تک پہنچ سکا ہے۔ خود حقی صاحب کے الفاظ میں، یہ لغت دولسانی لغتوں کی طرح ڈالنے والے اُن متقدمین جنھوں نے اپنے اپنے عہد میں اِس کا حق ادا کیا، کے اُس سلسلے کی تازہ ترین تالیف ہے جو اٹھارہویں صدی میں شروع ہوا تھا، اور اِس سے دورِ حاضر ہی کی نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ جہانِ امروز کی عکاسی ہوتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوے اُس کی جلد بندی وغیرہ کے اُمور پر بات کرنا کتنی بڑی بداخلاقی ہے لیکن اِس لغت کی پیش کش کے بارے یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اِس کے سرورق پر پس منظر میں دیا گیا آبی مارکہ جو مزارِ قائد کا بالائی حصہ ہے، صاحبِ مزار کے اردو زبان کے متعلق ارشادات و نظریات کو بلاتخصیص ہر شعبۂ زندگی میں جاری کرنے کے عزم کا بجاے خود اِستعارہ ہے۔

اِس لغت کی اشاعت پر میں نے حقی صاحب کو مبارک باد دیتے ہوے ایک خط میں لکھا تھا کہ یہ لغت ایک طرح سے اُسی کام کی تکمیلی شکل ہے جو آپ کے والد مولوی احتشام الدین حقی صاحب نے شروع کیا تھا۔ آپ کے والد کی روحِ پرفتوح کیسی شاداں وفرحاں ہوئی ہوگی۔ حق بحقدار رسید! یہ الگ بات ہے کہ حق کی اِس رَسد میں نصف صدی سے بھی زائد وقت لگا ہے۔ اپنے ''اختلافی نوٹ'' میں میں نے حقی صاحب کو لکھا تھا کہ اِس لغت کو Concise Oxford کے بجاے Oxford Advanced Learner's Dictionary کے ڈھب پر ہونا چاہیے تھا۔ یادش بخیر! انجمنِ ترقیِ اردو کے مذکورۂ بالا لغت کی تدوین کی ذمے داری بھی حکومتِ حیدرآباد دکن کی طرف سے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کو سونپی گئی تھی اور اُنھوں نے یہ ہمہ وقتی کام بھی ۱۹۳۰ء میں مولوی احتشام الدین حقی صاحب کے سپرد کیا تھا، جنھوں نے اِسے Fowler کے Concise Oxford کے تتبع میں پورا کیا تھا۔

اِس دور کی غلطی ہاے مضامیں میں ایک یہ بھی ہے کہ مرتّب، مولف اور مصنف کا فرق بہ لطائف الحیل مٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ انجمن کے انگریزی-اردو لغت کے لیے سالہا سال تک رات دن کام کرنے والے خاموش کارگزار اور خاک نہاد مولوی احتشام الدین حقی صاحب کا نام لغت کے سرورق پر تو کیا، کسی دیباچے تک میں بھی ذکر نہ کر کے بہت ہی زیادتی کی گئی۔ آخر مقتدرۂ قومی زبان پاکستان کے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے قومی انگریزی-اردو لغت کے آغاز میں بھی تو ایک کامل صفحہ اِس بڑے کام کے کارگزاران کے ناموں کا لگایا گیا ہے؛ اِس سے جمیل جالبی صاحب جیسے عبقری جن کا قدیم اردو کی لغت کی شکل میں یکہ وتنہا کیا ہوا کام ہمیشہ حوالے کے طور پر استعمال ہوتا رہے گا، کی قامت میں کمی نہیں آئی۔ خود شان الحق حقی صاحب نے بھی اپنے مذکورہ آکسفرڈ انگریزی-اردو لغت کے اِبتدائیے میں اپنے ہم کاروں کا ذکر کیا ہے اور بہت ہی اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ بلکہ میں نے تو جہاں بھی حقی صاحب کی لغت پر کام کے سلسلے میں کوئی تحریر دیکھی ہے، اُنھوں نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا ہمیشہ ذکر کیا ہے۔ اصل میں ماتحت عملے کی پیٹھ ٹھونکنا اور ہم کاروں کی کارگزاری کا اعتراف جہاں ایک اہم اخلاقی ومعاشرتی قدر ہے وہیں پر ایک خاص جوہرِ ذاتی بھی ہے، جو ضروری نہیں کہ ہر آدمی کو مُقَسّمِ حقیقی سے وافر ملا ہو۔

لغت نویسی کا کام ادبی کھیمٹا لگانے کی مانند نہیں ہوتا۔ حقی صاحب عمر کے آٹھویں اور نویں عشرے میں اِس لغت پر روزانہ پندرہ پندرہ گھنٹے سے بھی زیادہ تک کام کرتے رہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اِسے مرتّب کرنے میں

آنکھوں کا کتنا تیل نکلا ہوگا۔لغت پر کام کرنے میں وہ عربوں میں ابنِ منظور (لسان العرب)، ایرانیوں میں علی اکبر دہخدا (لغت نامہ) اور انگریزوں میں James Murrey اور Henry Bradley (OED) کے ''ہم زبان'' نہ سہی، ہم سنگ ضرور ہیں (ع کے فلان شخصے بہ فرِّ شعر ہم سنگِ من است) بلکہ ایک جہت سے تو حقی صاحب کسی بھی بڑے سے بڑے لغوی سے کئی گنا بلند ہیں کہ اُنھوں نے دو اَبعادی کام کیے: اوّل، کلاں اردو لغت اور دوم، انگریزی-اردو دو زبانی لغت ؛ جب کہ مذکورۂ بالا عظیم لغت نویسوں نے صرف ایک زبان کا، اور وہ بھی اپنی زبان کا، کام کیا ہے۔ اور جن بڑے لغت نویسوں نے بے مثال ذولسانی لغات ترتیب دِیے ہیں، مثلاً Fallon، Forbes، Platts اور Richardson وغیرہ، اِن کا کوئی بسیط یک لسانی کام موجود نہیں ہے۔

اور پھر، اِن دو قسم کی برتری کے علاوہ، کسی بڑے لغوی کا کوئی بڑا ادبی کام میرے موجود علم میں نہیں ہے جب کہ حقی صاحب کی پرآب و تاب شخصیت کئی ایسے خوش تراش ادبی پہلوؤں کی جامع ہے جن کی جودت کے سامنے آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔ اُن کے بارے میں جہاں یہ بات درست ہے کہ بیک وقت اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے (اپنے والد کے بعد) وہ واحد لغت نویس ہیں وہیں یہ بات بھی پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو-اردو لغت اور انگریزی-اردو دو زبانی لغت پر اُن جیسا کارگزار، عالم آدمی اب تک کوئی نہیں گزرا۔ میرے موجود علم کے مطابق وہ برِعظیم پاک و ہند یا تاریخِ اسلام ہی کے نہیں بلکہ تاریخِ عالم کے بھی اہم ترین لغت نویس ہیں۔

یوں بڑے حقی اور چھوٹے حقی وہ لوگ ہیں جو کہہ کر نہیں بلکہ کر کے دکھا گئے ہیں کہ لغت پر کام کرنے والے لوگ کون تھے اور نام بنانے والے کون۔ آکسفرڈ کے اِس دولسانی لغت کی تکمیل پر پچھلی نصف صدی سے جاری یہ بحث بھی ایک خوب صورت موڑ لے کر ختم ہوگئی ہے: Actions speak louder than words.

☆

حقی صاحب کا تیسرا (ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے دوسرا) لغت مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد کا شائع کیا ہوا فرہنگِ تلفظ ہے، جو میری ناچیز رائے میں آج کے ہر اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والے کی میز پر ضرور ہونا چاہیے۔ ایک بار میں نے اُنھیں بتایا کہ میں نے فرہنگِ تلفظ کو از اوّل تا آخر پڑھا ہے۔ وہ بہت حیران ہوے اور فرمایا کہ ناممکن ہے کہ کوئی آدمی کسی لغت کو مکمل پڑھ ڈالے۔ عرض کیا کہ میں نے نہ صرف پڑھا ہے بلکہ بہت سے ایسے الفاظ کو نشان زد بھی کیا ہے جن کا فصیح تلفظ کلاں اردو لغت میں آپ کے لغت سے مختلف ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ اِس

لغت پر نظرِ ثانی کر چکے ہیں اور آئندہ مقتدرہ والے اِسے اِن تبدیلیوں کے ساتھ ہی شائع کریں گے۔ اُن کے یہ دریافت فرمانے پر کہ میں نے کس طرح یہ لغت پورا پڑھ ڈالا، میں نے بتایا کہ میں نے روزانہ دو حروفِ تہجی پڑھنے کا اہتمام کیا، اور اِسے مقدور بھر نبھایا بھی۔ یوں ایک مہینے کے اندر ہی یہ خواندگی اور یادداشتیں قلم بند کرنے کی منزل بحمداللہ سر ہوگئی۔ حقی صاحب نے اِس موقع پر مجھے بے اختیار a really wonderful man کہا، اور اِنھی الفاظ سے وہ مجھے بعد میں کئی بار بلاتے رہے۔

حقی صاحب کا چوتھا لغت جامع الامثال ہے۔ مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد سے شائع شدہ اِس بے مثال لغت کو اصلاً وارث سرہندی صاحب نے مرتّب کیا تھا۔ حقی صاحب نے اِس پر جیسی بھرپور نظرِ ثانی (Thorough revision) اور حک و اِضافہ کیا تھا اور اِس میں ساختیاتی تبدیلیاں (Structural changes) کی تھیں، اِن کی وجہ سے وہ اِس لغت میں شریک مرتّب ٹھہرتے ہیں۔

☆

یوں اگر انگریزی-اردو لغت سے متعلق مسلمانوں کے کیے ہوئے کاموں کی تاریخ مختصراً بیان کی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ کام مولوی احتشام الدین حقی کی لگ بھگ ڈیڑھ عشرے کی شبانہ روز محنت سے شروع ہوا جو، نصف صدی کے بعد، ایک عشرے کی جان توڑ محنت کو ایندھن کرنے کے نتیجے میں اُن کے بیٹے شان الحق حقی کے ہاتھوں مکمل ہوا۔ وہی اپنے قابل بیٹے کو لغت نویسی کے اصول و آداب سکھانے والے معلم بھی تھے کیوں کہ اُن کے دور میں اُن کے پائے کا انگریزی-اردو دوزبانی لغت پر کام کا ماہر اور کوئی نہیں تھا۔ (حقی صاحب نے اپنے عظیم والد کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ رات گئے تک کام کرتے اور میں صبح اُن کی میز پر جا کر اپنے شوق سے لکھا ہوا مسودہ پڑھتا تھا۔)

اِسی طرح اگر شان الحق حقی صاحب کی لغات سے متعلق کارگزاری مختصراً بیان کی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ اردو لغت بورڈ کا بسیط کلاں اردو لغت اُن کا سب سے بڑا اور بے مثال کارنامہ ہے۔ انجمنِ ترقیِ اردو کا انگریزی-اردو لغت اپنی بہار دِکھلا چکا ہے اور اب آکسفرڈ کا انگریزی-اردو لغت بہار پر ہے، جو حقی صاحب کا دوسرا بڑا لغوی نشانِ جادہ ہے اور جس کی تلخیص بھی شائع ہو چکی ہے۔ اُن کے اِس سفر کا تیسرا بڑا پڑاؤ فرہنگِ تلفظ ہے اور چوتھا جامع الامثال۔ اُن کا پانچواں لغت آکسفرڈ جامع اردو-اردو لغت ہے جس پر وہ آخری عمر میں کام کر رہے تھے۔ (شایان صاحب نے بتایا ہے کہ ۱۴/ اگست ۲۰۰۵ء کو اُنھوں نے اِس لغت کے ایک سو اِندراجات

مکمل کر کے بھجوائے تھے۔) اِس کے بارے میں میرا گمان بلکہ وجدان ہے کہ یہ ایک ایسا یک جلدی لغت ہے جو دورِ حاضر کے تبدیل ہوتے ہوئے لسانی رویوں کے کامل اِدراک کے ساتھ تدوین کیا جا رہا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ لغت ایک طرح سے کلاں اردو لغت سے بھی کئی درجے آگے بڑھا ہوا ہوگا کیوں کہ اِس کی بِنا و تعمیر میں حقی صاحب کا لغت نویسی کا لگ بھگ نصف صدی پر محیط تجربہ بھی شامل ہے۔ میں کئی بار سوچتا رہا کہ کوئی دعا ایسی ہو کہ میری عمر اُنھیں لگ جائے اور وہ یہ لغت مکمل کر سکیں۔ اُن کا چھٹا لغت، جو اُن کے اپنے الفاظ میں ابھی lying in arrears ہے، اردو میں مستعمل عربی و فارسی امثال و اقوال پر مشتمل ہے؛ یہ وہ ذخیرہ ہے جو اُنھوں نے برسوں کی کتاب چشی میں جمع کیا ہے۔ کاش یہ لغت بھی طباعت کی منزل مار سکے۔

☆

میں نے ایک حرکت حقی صاحب کو بتائے بغیر کی جس پر مجھے اُن سے ڈانٹ پڑی۔ ہوا یوں کہ میری کسی زمانے میں اُتاری ہوئی دو تصاویر پچھلے سال یکے بعد دیگرے ڈاک کے ٹکٹوں پر چھپیں۔ ایک روز مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ حقی صاحب کی تصویر ڈاک کے ٹکٹ پر شائع کرائی جائے۔ ڈاک خانے کے مدارالمہام اپنے اِس قانون کو توڑنے پر آمادہ نہیں تھے کہ وہ کسی زندہ آدمی کی تصویر ڈاک ٹکٹ پر شائع کریں۔ میں نے اِس کا ایک حل سوچ کر محترمہ امینہ سید کو خط لکھا۔ ذیل میں اِس خط کی چند متعلقہ سطریں پیش کرتا ہوں:

.....Dear Madam! I know that at this stage of life Shanulhaq Haqqee sb is far above all awards and prizes. But I've an idea to present before you: I want that due to his being a lexicographer, writer and researcher par excellence, and his being the icon of bi-lingual works of lexical standing on the oriental languages and English, and having the mastery over the science of these languages- the things which have been instrumental in the development of this work- a postal stamp that includes the picture of Haqqee sb with a watermark of the Dictionary in the background should at least be developed. This will be a remark of thanks to this living-legend of our times. To give a citation, if the English can "worship" James Murrey, we should at least recognize our man who in various capacities, some of which are mentioned in your editorial note as well, surpasses the English-legend of lexicography: why should we not?

Hope you'll pay due attention to my request and manage the printing of a postal stamp in collaboration with the Pakistan Post.....

نتیجہ اِس ساری تگ و دو کا یہ نکلا کہ ڈاک خانے والے بھی، ہم پاکستانی عوام ہی کی طرح، مردہ پرست واقع ہوے ہیں!

.....

میں نے حقی صاحب کا ایک انٹرویو لینے کی بھی ٹھانی۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب، کہ میرے لیے اندھے کی لاٹھی کی سی حیثیت رکھتے ہیں، سے عرض کیا کہ وہ حقی صاحب کی شخصیت اور اُن کے کیے ہوے کاموں کے تناظر میں انٹرویو کے لیے سوالات مرتّب فرما دیں۔ اُنھوں نے نہ صرف یہ سوالات لکھ کر مجھے فیکس کیے بلکہ یہ بھی تحریر فرمایا کہ وہ مجھے اِن میں ترمیم و تنسیخ کا مکمل اختیار بھی دے رہے ہیں۔ کچھ باتیں ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر صاحب نے بھی پوچھنے کو کہیں۔ باقاعدہ سوال نامہ تیار کر کے اُنھیں بھیجا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اُن کی آخری بیماری شروع ہو چکی تھی۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے زیادہ سوالات لکھ دیے۔ اُنھوں نے کچھ باتیں تو بتا دیں اور باقی کے بارے میں فرمایا کہ اُن کے افسانہ در افسانہ سے مل جائیں گی۔ اِس انٹرویو کی تہ میں میرا مقصد اُن کے لغت سے متعلق کام بالخصوص آکسفرڈ کے انگریزی-اردو لغت پر ایک مبسوط تحریر/کتاب لکھنا تھا تاکہ اردو لغت پر کام کی حقیقی (نہ کہ سرکاری) تاریخ اور روداد محفوظ ہو سکے، اور یوں عربی کے ابنِ منظور، فارسی کے علی اکبر دہخدا، اور انگریزی کے James Murray کے ساتھ ساتھ اردو کا لغوی عبقری دنیا کے سامنے آ سکے۔ میرے انٹرویو کا بڑا حصہ دراصل اِسی مقالے کا خاکہ تھا۔ میں نے اُنھیں ایک طویل خط میں لکھا کہ اُن پر لغت کے حوالے سے کام کرنے کے لیے اُن سے بہتر خاکہ (synopsis) کون لکھ سکتا ہے۔ بہرحال، یہ کام ویسے نہ ہو سکا جیسے میں نے اِس کے بارے خواہش کی تھی۔

میں نے حقی صاحب سے اُن پاکستانی لوگوں کے بارے میں دریافت کیا جنھیں وہ لغت کے مسائل کے سلسلے میں اہم گردانتے ہیں۔ اُنھوں نے محمد سلیم الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر سید سعید احمد اور جنابِ ابراہیم سعد کے نام لیے۔ بعد کو اِس فہرست میں اردو کے حوالے سے مرزا نسیم بیگ صاحب کے نام کا اضافہ فرمایا۔

''لغت نوردی'' کے شوق اور ایک طویل عرصے سے انگریزی کے مختلف لغات سے طالب علمانہ آشنائی نے اردو لغات کے سلسلے میں میرے ذہن میں پانچ بڑے اور دو چھوٹے کام کیے جانے کی خواہش کو شدید تر کر دیا ہے۔ اِن میں پہلا اردو قاموس الامثال (corpus) ہے، دوسرے اردو فوقانی لغت، تیسرے اردو لغتِ موضوعات (Lexicon)، چوتھے اردو لغتِ مترادفات ومتضادات، پانچویں اردو لغتِ معکوس، چھٹے اردو اِشاریۂ الفاظ (Indexionary) اور ساتویں تصویری لغت۔ ذیل میں اِن کا مختصر تعارف پیش کرتا ہوں:

میری بڑی پرانی خواہش ہے اردو کے تمام الفاظ، محاورات وضرب الامثال ہر ممکن shade of meaning کے ساتھ آج کل کی ضرورت کے جملوں میں استعمال کیے جائیں تا کہ اِنھیں حیاتِ تازہ مل جاے۔ میں نے حقی صاحب کی توجہ اِس امر کی طرف منعطف کرائی اور اردو کے لیے ایک قاموس الامثال - جو باقاعدہ computerized بھی ہو- بنائے جانے کی اِس خواہش کا بار بار اِظہار کیا۔ یہ قاموس اصلاً روزمرہ استعمال کے جملوں کی مثالوں کا حامل ہونا چاہیے تاہم اردو کے کلاسیکی ادب کی اسناد کے وہ کارڈ جو اردو لغت بورڈ کراچی اور مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد وغیرہ کے ہاں رکھے ہیں، بھی computerize ہو جانے چاہییں۔ وہ میرے اِس خیال سے متفق تھے۔ اِس موضوع کے کئی پہلوؤں پر اُن سے کئی بار باتیں ہوئیں۔ میں اِس سلسلے کے اپنے ایک برقیاتی خط سے ایک اقتباس کرتا ہوں:

.....Your work on the Urdu dictionary of Dictionary Board Karachi matches to Ali Akbar DehKhuda's 50-volumed "Lughat Nama" of Persian: his work was the outcome of the efforts and study of 45 years, your work is like the same. The main difference between the two is the fabric of presentation and content: DehKhuda's work is "encyclopaedic" in nature whereas yours is pure "lexicographic" in disposition. Maybe I'm totally in the wrong since I'm not a man of letters. This comment is of a reader of literature of commoner level. What I'm to ask is that if there's a chance of developing an Urdu-corpus, like that of the Collins's COBUILD, which was taken as example for all dictionary producers later? It has, as you know, everyday sentences as examples in contrast with the quotations from classical literature. Together, if you manage some organization to "computerize" the 13,00,000 quotations in an

Urdu word processor, it can be available even on CD so that find/search options could be used to getting to the required usage. I admit that you are not in an age when works of this nature could be taken up, but you can lay the foundation on the right lines, like that of your foundation work of the Urdu Dictionary of Dictionary Board Karachi. I am putting this request to you only because I dare to brand you the title "Baba-e-Urdu" of our times.....

دوسرا لغت جو میری سوچی سمجھی رائے میں بہت ہی جلد سامنے آنا چاہیے، اور جس پر حقی صاحب سے بہت دیر تک باتیں اور خط کتابت ہوتی رہی، Oxford Advanced Learner's Dictionary کے ڈھب اور ڈَھچر پر یک جلدی اردو فوقانی لغت ہے؛ یعنی لفظ، تلفظ، مادّہ و مبداء (origin)، لفظ کے محاوراتی اور روزمرہ استعمال کی غیر کلاسیکل مثالیں (یعنی ایسی مثالیں جو روزمرہ کے استعمال کے جملوں پر مشتمل ہوں)، لفظ کا تلمیحاتی اور ضرب الامثال کے حوالے سے استعمال، یک لفظی مترادفات و متضادات، اور کچھ اہم الفاظ کے استعمال پر قواعدی شذرات- کہ آکسفرڈ کے مذکورۂ بالا لغت کی ترتیب بڑی حد تک یہی ہے۔ میرا نکتہ یہ تھا کہ لفظ کے استعمال کی مثالیں روزمرہ زندگی میں پیش آنے حالات سے دینی چاہییں تاکہ ہر مزاج اور اہلیت کا قاری لغت کو اپنے لیے دوست اور راہ نما محسوس کرے۔ حقی صاحب نے مجھے لکھا کہ وہ میرے نقطۂ نظر کی تحسین کرتے ہیں اور ایک طول طویل برقیاتی خط میں مجھے اِس سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا، اور کچھ کتابوں کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اِس اہم خط سے چند جملے اقتباس کرتا ہوں:

Dear Hafiz Sahib, I got your message regarding what you expect from a dictionary, and I appreciate your point…..

But remember, in the first place, that you do not learn a language from books alone, or dictionaries, but through direct social contacts. Even the help books such as the Fowler Brothers' King's English, Modern English Usage etc., are inadequate. The New York Times has been running a regular column of discussions on fine points of English language, a selection of which has come out in the form of a book. You may be interested in getting a copy of it. It makes very interesting reading.

Secondly, dictionaries cater to various needs and are compiled on different scales from pocket dictionaries to a magnum opus like the

greater Oxford or the New English Dictionary. It does full justice to the semantics of English vocabulary by quoting examples covering all shades of meanings and usage. In this way it quotes 25 examples of a simple noun "crow" and over a hundred examples of "culture."

The Urdu Board's dictionary was supposed to follow the model of NED but its scant resources both intellectual and financial were not up to the task. Still, when I left the Board, I had left behind about 1,300,000 cards bearing quotations drawn from a wide reading of literature, much of it by myself. One has to have recourse to books for authenticity and the books especially of fiction, cover a goods deal of colloquialism besides the literary or formal vocabulary, which you say is not enough…..

اپنے وقت کے سب سے بڑے لغوی کا میرے نقطۂ نظر پر صاد کرنا، میرے لیے ستارۂ امتیاز ہے۔

تیسرا اہم لغت اردو لغتِ موضوعات ہے، یعنی الفبائی ترتیب کے بجائے لغوی موضوعات کے تحت اندراجات یک جا کر دیے جائیں۔ جیسے مثلاً ''کتاب'' کے موضوع کے ذیل میں سرورق، پس ورق، ناشر، مطبع، طباعت، اِشاعت، عالمی معیاری کتاب نمبر، وغیرہ سارے الفاظ ایک جگہ اکٹھے ہوں بخلاف اِس کے کہ جیسے عام لغت میں یہ سب الفاظ اپنی اپنی جگہ الفبائی ترتیب میں آتے ہیں۔ یہ لغت مختلف پیشوں کے اُن لغات سے بالکل مختلف چیز ہے جو مقتدرۂ قومی زبان اور شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعۂ کراچی وغیرہ نے شائع کیے ہیں۔ اِس لغت کی مثال کے لیے Longman English Lexicon ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ Edward William Lane کا Arabic-English Lexicon بھی اِسی قبیل سے ہے، اگرچہ براہِ راست میرے مجوزہ لغت کی مثال نہیں ہے۔

لغتِ مترادفات ومتضادات ایک واضح چیز ہے؛ یہ وہ لغت ہے جو اَب تک سنجیدگی سے مکمل نہیں کیا گیا۔ رفیق خاور صاحب کا سالہا سال کی جان کھپی کر کے مرتَّب کیا ہوا اردو تھیسارس غنیمت بلکہ نعمت ہے۔ تاہم اُن کے اپنے الفاظ میں ''یہ اِس سلسلہ کی اِبتدائی کوشش'' ہے جس پر بہت کام کیا جانا ابھی باقی ہے۔ حقی صاحب نے مجھے مرحوم رفیق خاور صاحب کے اردو لغت بورڈ سے تعلق کے بارے میں بتایا اور اِس تھیسارس کی زائیدگی کے بارے میں پس منظری معلومات بھی دیں۔ اِسی طرح احسان دانش صاحب کا اردو مترادفات بھی ایک اچھا کام ہے تاہم یہ صحیح معنوں میں مترادفات کا لغت کہلانے کے بجائے، بڑی حد تک، تراکیب و محاورات کو یک جا کرنے کا عمل ہے۔

آپ اِسے کسی حد تک قائداللغات یا نسیم اللغات کی تلخیص کہہ سکتے ہیں جس میں الفاظ کے معانی اور اسناد حذف کر دی گئی ہیں اور اصل اندراجات کے تحتی الفاظ/تابعات یک جا لکھ دیے گئے ہیں۔ اردو سائنس بورڈ لاہور کا قاموسِ مترادفات از وارث سرہندی بہرحال بہت اچھا ہے۔

لغتِ معکوس دراصل ''خیالات کا لغت'' ہے، جس میں ذہن میں چکر لگاتے ہوئے خیالات کو کسی اصطلاح یا مخصوص لفظ کا پہناوا دیا جاتا ہے۔ مہر فوقی بدایونی کا لغاتِ مہر کے نام سے ۱۹۸۲ء میں کراچی سے شائع ہونے والا لغت، اردو میں لغتِ معکوس کی اب تک واحد مثال ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اِسے نرم سے نرم الفاظ میں بھی کسی طور معیاری نہیں کہا جا سکتا۔ انگریزی میں اِس کی کئی شان دار مثالیں ہیں جیسے Bernstein اور 'Readers Digest کی Reverse Dictionary۔

اِشاریۂ الفاظ (Indexionary) میں الفاظ کے اختتامی الفبائی حرف سے اِندراج شروع کیا جاتا ہے (معکوس الفبائی ترتیب)۔ جیسے مثلاً گنجان، طوفان، مہمان، مکان میں یہ ترتیب اِس طرح ہوگی: مہمان، مکان، طوفان، گنجان۔ جرمن زبان اور لسانیات کے پروفیسر Donald A Becker کی اِدارہ Manohar ہندوستان سے ۱۹۸۰ء میں چھپی ہوئی A Reverse Dictionary of Urdu سے پہلے اردو میں یہ لغت عنقا تھی، اور اب بھی یہ کم یاب ہے اور بہت سے اہلِ علم بھی اِس بے مثال لغت کی موجودگی سے لاعلم ہیں۔ انگریزی میں اِس کی ایک ہی مثال Behzad Kasravi کی INDEXionary ہے جسے '' an index to English vocabulary'' کہا گیا ہے۔

ساتواں لغت تصویری لغت (Visual Dictionary) ہے جس میں انگریزی کے Macmillan اور The Facts on File والوں کی Visual Dictionaries اور عربی میں ڈاکٹر روحی البعلبکی کی المورد المرئی کی طرح عام استعمال کی چیزوں کے اعضا کی اِسم بندی (Labelling)، اردو میں کی گئی ہو۔

آخر میں درج کیے گئے دو لغات بھی اگرچہ بہت کام کی چیزیں ہیں لیکن یہ بہرحال پہلے ذکر کردہ پانچ لغات جتنے اہم، تکنیکی اور فوری کام نہیں ہیں۔

حقی صاحب سے مندرجۂ بالا ساتوں اردو لغات کے بارے میں میری طویل گفتگوئیں ہوتی رہی ہیں۔ ساتویں نمبر پر درج کیے گئے لغت کے علاوہ وہ باقی سب لغات کے حق میں تھے اور اُنھوں نے اِن کے بارے میں مجھے وقتاً فوقتاً کئی ہدایات بھی دی ہیں، جن کا الگ الگ تفصیلی ذکر ایک اختصاصی نوعیت کی چیز ہے اور ایک مستقل

موضوع۔ یہ کہنا قرینِ حقیقت ہے کہ میں ایک قاری اور طالبِ علم ہونے کے ناتے صرف ''یوں ہونا چاہیے تھا'' یا ''یوں ہونا چاہیے'' کی سطح پر تھا، حقی صاحب ایک جوشیلے طالبِ علم کی اِس ''ہونا چاہیے'' کی تشکیل کیا کرتے تھے۔ کاش کہ اہل لوگ اِن نہایت ضروری کاموں کو اوڑھ لیں اور جلد انجام دے سکیں۔

- ۴ -

حقی صاحب جہاں انگریزی محاورے، مقولوں اور کہاوتوں کے لیے مترادف اردو محاورے، مقولے اور کہاوتیں لانے میں اپنی مثال آپ تھے وہیں بہت سرعت سے اردو میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کے مترادفات اور اِصطلاحات بھی بنا دیا کرتے تھے۔ SMS کے لیے سندیسچہ/دوحرفیہ، Email کے لیے برقیاتی ڈاک/خط، To whom it may concern کے لیے ہرگاہ کہ، Through proper channel کے لیے بالواسطہ حسبِ ضابطہ، وغیرہ۔ اُنھوں نے میرے موقع بہ موقع دریافت کرنے پر اِتنے الفاظ و اِصطلاحات کے مترادفات بتائے ہیں کہ جن کو محض چھانٹنا اور بُہارنا بھی ایک بڑی فرصت کا متقاضی ہے۔ اِن میں کے زیادہ تر میرے شعبے یعنی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے متعلق ہیں۔

حقی صاحب میرے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے متعلق کسی اصطلاح کا اردو مترادف پوچھنے پر یہ ضرور فرماتے تھے کہ یہ مترادف مجھ سے پوچھنے کے بجائے آپ مجھے بتائیے، کہ آپ اِس میدان کے آدمی ہیں اور اِس شعبے میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کے سب سے بہتر مترادفات آپ ہی بنا سکتے ہیں۔ میں بھی بہت غور و خوص کے بعد حقی صاحب کی رائے کا حامی بنا ہوں، یعنی دفتر کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے کوئی اصطلاح جڑ دینے کے بجائے اُن لوگوں (''کرخنداروں'') کے پاس چل کر جایا جائے جو کوئی کام خود کر رہے ہوں: ایسے دو تین مجمعوں میں جا کر اُن کے کام کو دیکھتے ہوئے اُن کے زیرِ استعمال اصطلاح کو، جو اُس کام کے ''عمومی عوامی جینیس'' کا پھل ہے، دیکھا اور جانچا جائے؛ اور پھر اگر آپ کے پاس اِس مستعمل اصطلاح کے مقابلے میں کوئی ایسا متبادل ہو جو مانوس اور بولنے میں آسان ہو، تو اِسے تجویز کر دیا جائے۔ اگر اہلِ حرفہ اِسے قبول کر لیں تو بجا، ورنہ اِس کی پہلی شکل کو چلنے دیا جائے یا اِسی کو اُردو والیا جائے، اور بعد ازاں رفتہ رفتہ لغو یا لیا جائے (Lexicalize)۔ وضعِ اصطلاحات کا فطری طریقہ یہی ہے۔

حقی صاحب نے مجھے اِصطلاحات سازی کے بارے میں ایک اُصول یہ بتایا کہ کسی اصطلاح کے وضع

کرنے کے لیے سب سے پہلے اُس کے اِستعمال پر نگاہ کرنی چاہیے نہ کہ اُس میں موجود تعمیری سانچوں (building-blocks) پر۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ مصنوعی/ میکانکی اِصطلاح سازی کہی جائے گی جو بولنے میں مشکل سے مشکل ہوتی چلی جائے گی اور اِسی وجہ سے رواج نہ پا سکے گی۔ اِس کی مثال اُنھوں نے یہ دی کہ vaccination کے لیے عوام نے ایک ہلکا پھلکا لفظ ٹیکا بنالیا۔ اور زبان سے آسانی سے ادا ہو سکنے کی خوبی کا حامل ہونے کی وجہ سے یہی لفظ چلن دار بھی ہو گیا۔

اُنھوں نے بتایا کہ وضعِ اِصطلاحات اور مترادفات کی تلاش میں اِس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اِس میں کانوں کے لیے کچھ ''نیا پن'' ضرور موجود ہو اور زبان پر لذت آجائے۔ اِسے بالکل مشینی اور بے کیف (spot) نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اِصطلاحات کی لغات کتابوں کے شہرِ خموشاں کی آبادی میں اضافے کا سبب بنتی رہیں گی۔ اُن کے ایک برقیاتی خط سے ایک مختصر اقتباس کرتا ہوں کہ اُن کا نقطۂ نظر اُن کے اپنے الفاظ میں سامنے آسکے:

.....If a language is in current use, new terms are automatically generated as the fruit of collective genius of the people, which does wonders. No Boards or academic bodies need to be set up for coinage of new terms.....

حقی صاحب نے بہت سے الفاظ اور تراکیب کے بارے میری راہ نمائی فرمائی۔ صرف ایک لفظ کے بارے میں عرض کرتا ہوں: ایک بار میں نے دو انگریزی الفاظ کو cum درمیان میں لگا کر جوڑنے کی بابت دریافت کیا کہ ایسی ترکیب بندی میں ترجیح کون سے لفظ کو ملے گی؟ آیا اُس لفظ کو جو cum سے پہلے لگایا گیا ہے یا اُسے جو بعد میں لایا گیا ہے۔ یعنی اگر ایک جماعت کے بارے میں political-cum-religious کی ترکیب استعمال کی جائے تو اِس سے اِس جماعت کی کون سی جہت کو ترجیح ملی، سیاسی جہت کو یا مذہبی جہت کو؟ حقی صاحب نے لکھا کہ ترکیبِ عطفی میں کسی لفظ کے پہلے یا بعد میں آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ایک بار اُن کا سفری کمپیوٹر (Laptop) کچھ نافرمان سا ہو گیا۔ اُنھوں نے مجھے اِس کی اصلاحِ احوال کے لیے موقع دیا۔ نافرمانی کے وجوہات دور ہونے پر یہ کمپیوٹر، جو پہلے بالکل الف ہو گیا تھا، رام ہوا تو وہ میرے بہت شکر گزار ہوے۔ اگرچہ یہ کام بین البراعظمی فاصلے سے کرایا گیا تھا اور سارے کا سارا اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا لیکن اِس کے بعد بھی اُنھوں نے مجھ سے کئی باریکیاں دریافت کیں۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ اِس طریقے کو

جُگاڑ لگانا کہتے ہیں، جسے بہتر زبان میں شاید تُکّا لگانا کہا جائے گا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ لفظ پہلے سے اُن کے علم میں نہیں تھا، اور یہ بہترین اصطلاح ہے hit & trial method کے لیے۔

اِس بات کا ذکر ضروری ہے کہ حقی صاحب نے فقط خود ہی میری راہ نمائی نہیں کی بلکہ اِستفادے کی اور راہیں بھی دکھائیں۔ کئی بار اُنھوں نے مجھے کسی لفظ کے بارے میں خود بتانے کے بعد مرحوم مشفق خواجہ صاحب سے اور کبھی مقتدرۂ قومی زبان سے بھی مشاورت کا حکم فرمایا، جہاں میں جنابِ عطش درانی سے رابطہ کرتا رہا۔ وہ مقتدرہ کے صدر نشین پروفیسر فتح محمد ملک صاحب کی شفقت اور منکسر المزاجی کے بیان میں ہمیشہ رطب اللسان رہے۔ اُنھوں نے مجھے ملک صاحب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ تحسین وتردید پڑھنے کو کہا۔ مجھے اِن مضامین میں ملک وملت کی بے تکان محبت کی وہی پس منظری لہر محسوس ہوتی ہے جو جنابِ مختار مسعود کی تحریروں میں رواں نظر آتی ہے۔

- ۵ -

حقی صاحب نے ادب کی بہت سی اصناف میں اور بڑے مفید موضوعات پر قلم چلایا ہے۔ اُن کے کیے ہوئے کام ایسے نہیں جن کی ضرورت صرف اِمروزہ ہو۔ اُن کی تحریریں مقداروکمیت کے پیمانے پر بھی زیادہ ہیں اور ''کیفیت'' میں بھی اردو کا عزیز سرمایہ ہیں۔ بچوں سے لے کر ہر عمر اور شعبے کے بڑوں تک کے لیے اُنھوں نے بہت کچھ لکھا جس کا ایک اہم حصہ ابھی اشاعت کی وادی قطع نہیں کر پایا ہے، لیکن اُن کی کسی ایک بھی تحریر پر اِہمال یا فرسودگی (Hacking) کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اُن کی حیاتِ قلم تقریباً سات دہائیوں پر محیط ہے لیکن وہ کہیں اپنے آپ کو دوہراتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ وہ کم استعمال ہونے والے، خوابیدہ اور گم شدہ الفاظ سے اپنی تحریر کو سنوارتے ہیں لیکن یہ سنوار، ریزہ کاری محسوس نہیں ہوتا۔ اُن کا من بھاونا لہجہ ہر تحریر کو شروع سے آخر تک ایک ہی نشست میں پڑھوا کر چھوڑتا ہے۔ نثر ہو یا نظم، دونوں میں حسنِ توازن اور خوش ترکیبی اُن کا خاص کمال ہے۔ وہ لفظوں کو قیمتی سکّوں کی طرح سنبھال کر رکھتے اور مناسب ترین محل میں استعمال کرتے ہیں۔

نثر میں اُن کی ہر تحریر کا ٹھاٹھ کسی واضح مقصد پر قائم دکھائی دیتا ہے۔ اپنی نثر میں وہ قرآنِ پاک اور احادیث سے اقتباس کرتے نظر آتے ہیں یا پھر کسی بڑے اور باوقار اہلِ قلم سے؛ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے الفاظ مستعار لے کر استعمال کروں تو یوں کہوں گا کہ اُن کے یہاں کسی مجہول لکھنوی یا مہمل دہلوی سے کوئی اقتباس کیا گیا نہیں ملے گا۔

شعر میں حقی صاحب تھوڑے لفظوں میں بہت سی تاثیر بھر دیتے ہیں لیکن مصرعوں کو کٹار نہیں بننے دیتے۔ سہج سبھاؤ سے مکالمت کو مغازلت میں تبدیل کرنا اُن کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی شاعری میں نا آشنا الفاظ کے نظر آنے کی وجہ اُن کا لغت سے شغف ہے کیوں کہ عام شعرا کا ذخیرۂ الفاظ اُتنا ہو ہی نہیں سکتا جتنا کہ ایک لغوی کا ہوتا ہے، اور وہ بھی حقی صاحب جیسے کئی زبانوں کے عالمِ بے بدل کا۔ یوں زندگی بھر لغات کی فضا میں سانس لیتے رہنے کی وجہ سے کوئی لفظ اُن سے چھپا نہیں رہا۔ اُن کے ذخیرۂ الفاظ میں بڑھوار اس لیے بھی ہوئی ہے کہ وہ، بقولِ خود، اردو، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے ادبِ عالیہ کے ساتھ ساتھ اِن سب زبانوں کی ''چرکینیت'' سے بھی بسلامت گزرے تھے جس کی وجہ سے الفاظ کے استعمال کا کوئی پہلو (shade of meaning) بھی، من جملہ الفاظ کے ثقافتی پہلوؤں کے، اُن کی نگاہ سے اوجھل نہ رہا۔ (اُن کا ایک جملہ ہے: میں نے اِلٰہیات سے لے کر معاملات و واردات بلکہ خرافات تک سے پرہیز نہیں کیا۔ اُن کی موخرالذکر کوچے کی شاعری بھی، یک جا، مشفق خواجہ صاحب کے ہاں رکھی ہے۔ اور، اِسی قبیل کی کچھ چیزیں اُنھوں نے جنابِ امجد اسلام امجد کو اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل اِرسال کی تھیں اور مجھے ہنستے ہوئے فرمایا تھا کہ: ''آپ کو اِس لیے نہیں بھیجیں کہ آپ کا اَخلاق خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔'' اِس پر میں نے عرض کیا کہ آپ یوں کہیے کہ اَخلاق مزید خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔) خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ حقی صاحب کی شاعری کو اُن کی لغت نویسی کے ضمیمے کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔

ذخیرۂ الفاظ کی افزونی کے ذکر سے یہ بات ذہن میں آرہی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی طرح حقی صاحب کے ہاں بھی ہر صفحے پر کوئی نہ کوئی نیا لفظ ضرور ملتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مولانا کے الفاظ بھاری بھرکم ہوتے ہیں جن کے سامنے آتے ہی آدمی از روے تپاک وتحیّر ہاتھ باندھے کھڑا ہو جاتا ہے جب کہ حقی صاحب کے زائیدہ و پرداختہ دھیمے دھیمے الفاظ و تراکیب سامنے آتے ہی خود کو استعمال کرانے کے لیے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اردو کے شان دار لغوی سرمائے کے استعمال کی خوب صورت نظائر سے اردو نظم و نثر کو مالا مال کیا ہے۔

حقی صاحب نے کمال چابک دستی سے اپنی نظم و نثر میں محاوروں کو بیندھا ہے بخلاف اِس کے کہ اُن کے عہد کے کچھ اہلِ قلم اور شعرا کے یہاں یہ عمل بہ تکلف کیا ہوا محسوس ہوتا اور بعض اوقات تو کھٹکتا بھی ہے۔ حرفِ دل رس پر سلمیٰ حقی صاحبہ کے حواشی کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ملتی ہے کہ اگر وہ توجہ نہ دلاتیں تو علم ہی نہ ہو پاتا کہ کیسا کیسا محاورہ برتا گیا ہے اور ترکیب بندی میں کیا کیا اجتہادات کیے گئے ہیں۔ زبان کے استعمال میں آسانی پیدا کرنا اور چھوت چھات سے دامن بچاتے بلکہ دامن چھڑاتے ہوئے ذولسانی رنگارنگی کو دل و جان سے قبول کرنا حقی صاحب

جیسے صحیح معنوں میں اہلِ زبان (جو اپنے والد کے بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پانے کی بنا پر آٹھوں گانٹھ اہلِ زبان کہے جا سکتے ہیں) کی وسیع القلبی ہے، اور اِس چیز کو سند دینے کے لیے اُنھوں نے ہندی اور فارسی کی مخلوط تراکیب کے ساتھ کہی گئی اپنی غزلیات کا ایک مجموعہ جواہر مالا کے نام سے شائع کرنے کا ڈول ڈالا تھا۔ میری رائے میں یہ مجموعہ مرتّب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی کہ ذولسانی رنگارنگی اور شتر گربگی میں تمیز کی جا سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اِس دیوان کی اِشاعت کی بابت اُن سے پوچھ نہ سکا، اگرچہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ اِشاعت کے لیے بالکل تیار ہے۔

.....

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب نے ادبی تنقید کے سلسلے میں ایک جگہ تحریر کیا ہے:

> .....تنقید میں تفہیم کے بعد تحسین کی منزل آتی ہے۔ تحسین دراصل کسی ادبی کاوش سے ہماری لطف اندوزی کی علامت ہے۔ آج کی تنقید تجزیہ اور جائزے اور نکتہ چینی میں ایسی اُلجھی ہے کہ تحسین سے محروم ہوگئی۔.....

میں نے حقی صاحب کے تنقیدی مضامین میں اِس ''گم گشتہ'' تحسینی رویے کی ایک توانا جھلک دیکھی ہے۔ دو مثالیں پیش کرتا ہوں: جوش صاحب نے اپنی آپ بیتی میں اپنے مخصوص انداز میں حقی صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس کی کڑواہٹ آج بھی تلخا دیتی ہے لیکن آپ حقی صاحب کا تنقیدی مقالہ جوشِ ذی ہوش پڑھ جائیے جو اِسی تناظر میں لکھا گیا ہے، آپ کو خاندانی شرافت، وقار، تمکنت اور حفظِ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے اختلافِ رائے کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے اُصولِ تنقید بھی اِس میں جاری ملیں گے جن سے ہماری ادبی تنقید کا دامن بالعموم تہی ہے۔ اِسی طرح پرتو روہیلہ صاحب کے ایک مجموعۂ کلام پر حقی صاحب کی تنقید نوائے شب پر ایک نظر بھی نہایت کمال کی چیز ہے۔ میرے خیال میں اِس مقالے کو نقادوں اور تنقید پڑھانے والے اساتذہ کو باقاعدہ اخذ و استفادہ کی نیت سے پڑھنا چاہیے، اور اِسے ادب کے نصاب کا حصہ ہونا چاہیے کیوں کہ اِس میں حقی صاحب نے تنقید پر ہی اِکتفا نہیں کی بلکہ آخر میں تنقید کے صحت مندانہ رویوں کی نشان دِہی کر کے اِسے ایک مستقل حیثیت اور تعلیمی نوعیت کا ادب پارہ بنا دیا ہے۔

حقی صاحب کے تنقیدی مضامین کے مطالعے کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُن کے ہاں تنقید میں محض زبان آوری، صرفۂ الفاظ یا کوری لکیر کی فقیری کا زور نہیں بلکہ کمال کی تعریف والا رویہ ملتا ہے، جسے مابعدِ تنقید کا تحسینی

پہلو کہا جانا چاہیے۔ایک قدیم اردو محاورے کی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے لکھے تنقیدی مضامین کے دامن پر فرشتے نماز پڑھتے نظر آتے ہیں۔اُن کے نمائندہ تنقیدی مقالات کی مثالوں میں بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے علاوہ مطالعۂ فانی، غالب کے استعارات کا بھید، اقبال کے نظریۂ خودی کے اصل مآخذ، نوائے شب پر ایک نظر، ادیب اور پیشہ وری، زخ ش اور اکبر کا فنِ ظرافت کے نام قلم پر آرہے ہیں۔ثانی الذکر اور ثالث الذکر مقالوں میں اُنھوں نے فانی اور غالب کے استعاروں کی شیکسپیئر کی تماثیلیات پر تحقیق کرنے والی خاتون Caroline Spurgeon جو انگریزی کی پہلی پروفیسر تھی اور ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک لندن یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی ادب کی سربراہ رہی، کے طریقے پر الفاظ شماری کی ہے اور اِن کے ذخیرۂ الفاظ اور تصورات کو آئینہ کر دیا ہے۔یہ حقی صاحب کا اعجازِ قلم ہے کہ اِن مقالات میں اُنھوں نے بہت سنبھال کر لکھا ہے ورنہ اگر کوئی اناڑی نقاد ایسا کرتا تو اِسے محاورتاً غالب کی شاعری کا مردہ خراب کرنا کہا جاتا یا پروفیسر عابد صدیق صاحب کے الفاظ میں مور کو ذبح کرنا- اور یہ کلاسیکل شاعری محض الفاظ کا گورکھ دھندا یا گوشت کا پہاڑ ہی معلوم ہوتی۔

تراجم میں حقی صاحب، محترمہ امینہ سید کی اصطلاح میں، قطعی کمال پسند (total perfectionist) فن کار کی طرح ایک ماحول کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر کے دوسرے ماحول کے لیے مِن وعَن ساز گار بنا کر نکالتے ہیں۔اُن کے ترجمہ کردہ نثر اور شاعری اپنی بُنت اور کیفیت کے اعتبار سے ''نقل مطابق اصل'' کی مثالیں ہیں جن کی ایک اضافی خوبی اِن کا اُجلا پن ہے۔اب تو وہ لوگ ہی تیزی سے اُٹھتے جا رہے ہیں جو اُن کے تراجم سے حقیقی علمی لطف لے سکیں۔

حقی صاحب نے مجھے بتایا کہ اُن کے کہے ہوئے سارے قطعاتِ تاریخ، وہ بھی جو اُن کے اپنے پاس تک موجود نہیں ہیں، مشفق خواجہ صاحب کے ہاں رکھے ہیں اور اِن کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔فرماتے تھے کہ وہ تاریخ گوئی کے لیے ''آمد'' کا انتظار کرتے ہیں۔واقعی، اگر اندر کی کیفیت حسبِ حال نہ ہو اور مادۂ تاریخ نکالنے کے لیے زور لگایا جائے تو اِسے ''تاریخ گوئی'' کے بجائے ''تاریخ گھڑی'' (engineered chronogram) کہنا چاہیے۔اُن کی قطعاتِ تاریخ بر وفاتِ اہلِ قلم و متعلقینِ اہلِ قلم میں ۱۹۸۵ء تک کہی گئی تواریخِ وفات موجود ہیں۔اِس کتابچے کے اِبتدائیے ''یادش بخیر'' میں اُنھوں اِس تہذیبی روایت اور مستقل فن کے ضمن میں اپنا ایک شعر لکھا ہے: ؎

دوستو رکھنا یہ سمٹے ہوے گوشے آباد
اب کوئی بزم سے جاے تو نہ جانے دینا

میری فرمائش پر اُنھوں نے مشفق خواجہ صاحب کا قطعۂ تاریخِ وفات لکھا؛ اِس سلسلے کے ایک برقیاتی خط سے اقتباس:

.....There also seems to be an emotional reason for the default on my part. My mind similarly refused to come up with a chronogram after my wife's death. Something deep within me hesitates to take home the tragic truth that the dear soul has departed. To compose a chronogram would put a seal to the bitter reality.

I have placed a requisition with the hatif-e-ghaibi for a suitable chronogram to commemorate the sad loss, which will never fade out, and will send it to you whenever it is ready.....

میں نے حقی صاحب کا قطعۂ تاریخِ وفات لکھنے کے لیے خواجہ منظر حسن منظؔر صاحب سے درخواست کی ہے جن کی تخصیص یہ ہے کہ وہ وقت، دن، مہینے اور سال کی تعیین کے ساتھ قطعہ کہتے ہیں، اور حق یہ ہے کہ کمال بے ساختہ اور برجستہ کہتے ہیں۔ افسوس کہ عمومی سہل انگاری اور سہل پسندی کی وجہ سے اب تو یہ علم ہی عدم کی راہ پر چل پڑا ہے۔ اللہ کرے کہ منظؔر صاحب یہ کام جلد کر سکیں۔

حقی صاحب کی نذرِ خسرو کو میں نے بہت ہی شوق سے پڑھا ہے۔ مجھے شعر فہمی کا دعویٰ نہیں لیکن پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی ریاضیاتی مشقیں بچپن میں بہت کی تھیں، اِس لیے اب یہ مطالعہ بہت ہی اچھا لگا اور بچپن کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ دو مکرنیاں پیش کرتا ہوں:

(۱)

پہروں مجھ کو گود بٹھائے
چھوڑ چلوں تو بَل بھر لائے
سب وہ بھلادے چکی چولھا
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی جھولا

(۲)

ہاتھ سے جب چھیڑا تھرّائی
پیر سے جب دابا غرّائی
ناپے سڑکیں اور بازار
کیا بھئی ناری؟ نا بھئی کار

اِس دوسری مکرنی کے ذیل میں حقی صاحب نے لکھا ہے کہ اِس میں ساجن کا نام نہیں لایا گیا، جو روایت سے اِنحراف اور گویا ایک نئی روش ہے۔ اب تو اخباروں میں بھی یہ صنف بہت کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ حقی صاحب کے ہاں کہہ

مکرنی کی صنف میں نئے مضامین کی سمائی کے اِس تجربے میں عجیب مٹھاس اور نیا پن نظر آتا ہے۔ یہ پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں ع خودکوزہ وخودکوزہ گروخودِ گلِ کوزہ کی بہترین مثال ہیں۔ کاش کہ شعری روایت کی پاس داری کا دم بھرنے والے شعرا بھی اور کچھ نئے تجربات کرنے والے شعرا بھی جو کسی صنف میں جگالی نہیں بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیت سے نئی جہات پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں، اِس اُسوہ و آئین پر چل سکیں جسے حقی صاحب نے اپنے عمل سے آج کے زمانے کے لیے موزوں (compatible) بنا کر دکھا دیا ہے۔ صلاے عام ہے!

.....

میں نے ادب کا باقاعدہ طالبِ علم نہ ہونے کے باوجود حقی صاحب کے ادبی کاموں پر رائے دی ہے، جسے رائے زنی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ میں اہلِ علم سے اِس جرأت پر معافی کا خواستگار ہوں، اور اگر کوئی اِفراط تفریط ہوگئی ہے تو اِس سے صرفِ نظر کرنے کا ملتجی بھی۔ میرا اور حقی صاحب کا واسطہ ایسا ہے جیسے تاج محل سے سامنے پڑا ہوا ایک کنکر۔ یہ کنکر اپنے صرف پتھر کا ٹکڑا ہونے میں تاج محل کا ہم جنس ہے، اور بس۔ ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب کے الفاظ استعمال کرتے ہوے کہوں گا کہ حقی صاحب کو ابھی تک کوئی اچھا نقاد نہیں ملا۔ اِس موضوع کو حقی صاحب کی ایک دعا پر ختم کرتا ہوں جو اُنھوں نے مجھے ایک بار برقیاتی خط میں لکھی تھی:

Dear Hafiz Sahib..... Thank you for your interest in me and my work. It is overwhelming. God bless you.....

- ۲ -

حقی صاحب نے میرے والد مرحوم پروفیسر عابد صدیق کی کتابیں اور مضامین مجھ سے طلب فرمائے۔ اُنھوں نے ایک خط میں مجھے لکھا کہ آپ کے والد ایک عالی مرتبہ اور ممتاز آدمی تھے۔ ایسے باپ کا بیٹا ہونا بڑے فخر کی بات ہے۔ بڑے عالم آدمی تھے آپ کے والد۔ موسیقی کا شغف بھی، دین پر عمل بھی۔ بہت متنوع۔ عالمِ دین تھے لیکن علماے سوء میں سے نہیں تھے۔

تعلّی اور انگریزی سے اردو ترجمے کے غیر ہو بہو (un-faithful) ہو جانے کے ڈر سے میں صرف ایک برقیاتی خط سے ایک انتہائی مختصر حصہ ذیل میں اقتباس کر رہا ہوں:

Dear Hafiz Saheb, ASA. Many thanks for sending me the material relating to your illustrious father. I find it fascinating. Your revered father

was indeed a great man. Among other things I admire his love of classical music, which our moulavis don't and even call it harem. Would that I had the privilege of meeting him when he was alive.....

میرے والد صاحب کے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعے تحسینیات کے بارے میں اُنھوں نے فرمایا کہ یہ بات حقیقت ہے کہ میں نے اِس عمر میں آپ کے والد سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اُن کے کئی مضامین مثلاً آزاد نظم کی غنائیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رجزیہ کلمات، ہماری کلاسیکی موسیقی کی ثقافتی اہمیت اور جابر صاحب کی باتیں وغیرہ سے مجھے بہت سی نئی باتوں کا علم ہوا۔ ثقافت کے موضوع پر اُن کی ہر تحریر میں مذہب کی روح اور محبت رسی بسی ہے۔ وہ بات کو بین السطور نہیں بلکہ علمی متانت، سلیقے اور توازن کے ساتھ وضاحت سے کرتے ہیں۔ جابر علی سید صاحب والے مضمون میں تشبیہ کی حقیقت بہت ہی اعلیٰ اور بالکل نئی چیز ہے۔ تشبیہ کی اِس پہلو سے تعریف میرے لیے ایک عجیب اور خوش گوار حیرت لے کر آئی ہے۔ مجھے بہت فائدہ ہوا، اور بڑا مزا آیا۔ اُن کا یہ جملہ کہ ''سارا قرآن ہی کلامِ موزوں ہے،'' ایک ایسی حقیقت ہے جو میرے خیال میں اُن سے پہلے کسی پر منکشف نہیں ہوئی۔ تلاوت کی کثرت اور باطن کے روحِ قرآن سے ہم آہنگ ہو جانے کی برکت ہی سے اُن پر یہ بات کھلی۔ میری خوش قسمتی ہوتی اگر میں ایسے عالم آدمی سے کبھی محض ملا ہی ہوتا۔

مغرب میں آزاد نظم اور اُس کے مباحث کے بارے میں اُنھوں نے فرمایا کہ ترجمے تو میں نے بھی بہت کیے ہیں لیکن ادبی مضامین کا فصیح اردو میں ایسا رواں دواں ترجمہ نہ میں نے پہلے کہیں دیکھا اور نہ خود کیا۔ اِن نہایت اہم مضامین کو بہت پہلے سامنے آنا چاہیے تھا تاکہ اردو میں آزاد نظم کا تجربہ کرنے والے شعرا آزاد نظم کی روایت سے آگاہ ہو جاتے۔ اگرچہ یہ چند صفحات ہیں لیکن آپ نے اِنھیں شائع کر کے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اگر مرحوم اپنا یہ مقالہ پورا کر لیتے تو نمعلوم اور بھی کیا کچھ سامنے لے آتے۔ بعض انگریزی ادبی اصطلاحات کے لیے بنائی گئی مترادف اردو ترکیبیں اور اصطلاحات بہت برمحل ہیں جو اردو کے مزاج اور فطرت سے اُن کی گہری آشنائی کا ثبوت ہے۔ فرانسیسی شاعری کی ہیئتِ ترکیبی یعنی غنائی آہنگ کی مثال میں حفیظ جالندھری کے پاکستان کے قومی ترانے کا ذکر کرنا اور لمرک کے تذکرے میں حضرت امیر خسروؒ کی کہہ مکرنی کی مثال لانا اُن کے اردو و فارسی ادب کی کلاسیکی روایت سے گہری قربت کا پتا بھی دیتا ہے اور مغرب کی شعری روایت سے مرعوب نہ ہونے کی دلیل بھی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ نامعلوم گوشوں سے کیسے کیسے بڑے کام کرنے والے لوگ نکل آتے ہیں اور روایتی انداز میں کام کرنے والوں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

میرے والد صاحب کے مجموعۂ کلام پانی میں ماہتاب اور ہندی شاعری کرن پٹاری کے بارے میں حقی صاحب نے فرمایا کہ اپنی شاعری سے مرحوم عابد صدیق صاحب مجھے ایک بھلے، سادہ اور بہت محبت کرنے والے آدمی لگے۔ اُن کے ہاں ایک گہرا سماجی درد اور ایک بلند تر دینی بصیرت یک جا نظر آتی ہے۔ اُن کی باتیں بہت کچھ حضرت امیر خسروؒ کی سی ہیں، یعنی مذہب اور کلچر کا امتزاج۔ یہ شاعری، پوری روایت سے جڑی ہوئی، لیکن اسلوب میں یکسر منفرد اور بالکل تازہ اور شاداب ہے۔ اُن کے ہاں بعض لفظ بالکل اچھوتے معنوں میں استعمال کیے نظر آتے ہیں جنھیں گویا اُنھوں نے راستوں سے چن کر ایک نئی آبرو بخشی ہے۔ غزلوں میں کہیں کہیں مذہبی اور صوفیانہ اصطلاحات کو بھی کمال سلیقے اور خوبی سے برتا گیا ہے۔ کئی جگہ پر عروضی تجربات بھی کیے گئے ہیں، اور اِن سے مغرب کے ملفوظی اور غنائی آہنگ کا علم بھی جھانکتا ہے۔ اُن کی آزاد نظمیں بہت ہی خوب صورت ہیں۔ جا بجا دلکش اور لاجواب بندشیں ملتی ہیں۔ پنجابی کلام میں صرف چار غزلیں، بہت ہی کم ہیں۔ کاش ذرا زیادہ ہوتیں۔ لیکن اِن کا بھی اپنا ہی لطف ہے۔ سماجی رویوں کے بیان میں یہ غزلیں ہیرے کی سی کاٹ رکھتی ہیں اور آب بھی۔

قرآن و حدیث اور فلسفہ و تصوف سے بیک وقت گہرا شغف اُن کی نعتوں میں اور بھی بلیغ پیرائے سامنے لایا ہے۔ اُن کی ہر نعت میں ایک اور ہی عالمِ نعت ہے: جذبات پوری طرح حدِ ضبط میں، لہجہ نہایت باوقار، اور ایک ایک لفظ میں ادب، احتیاط اور شعریت کے سب شعری اور شرعی قرینے ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ یہ کام صرف وہ کر سکتا ہے جو وسیع المطالعہ اور وسیع النظر عالمِ دین بھی ہو اور باکمال شاعر بھی۔

کرن پٹاری پڑھ کر سچی بات ہے کہ مجھے ہندوستان یاد آ گیا۔ کئی نظمیں تو بار بار پڑھیں مثلاً جوگی، ماں۔ ہندی شاعری میں کئی جگہ تو اُنھوں نے راگ ہی لکھ ڈالے ہیں، موسیقی لکھ دی ہے۔ ٹھمریاں بہت ہی اعلیٰ ہیں، کاش اُن سے سُن بھی لی ہوتیں تو معلوم ہوتا کہ اِن میں کتنا رس کتنا جس اور کتنا جادو ہے۔ دوہوں میں ہندوستان کا روایتی راجپوت کلچر خوب جھلکتا ہے لیکن یہاں بھی مذہب کی میٹھی میٹھی آنچ برابر محسوس ہوتی ہے۔ اُن کی ہندی شاعری کو دیوناگری میں ٹائپ کروا کے آپ نے بڑی خدمت کی ہے۔ اللہ ایسی سعادت مند اولاد ہر ایک کو دے۔ یہ دیوناگری مجموعہ بھی جلد شائع ہونا چاہیے۔

آپ نے اُن کا نظری کلام بھی شامل کیا ہے۔ اُن کے اِس کلام کے بارے میں خواجہ محمد زکریا صاحب کی رائے بالکل درست ہے۔ میں اپنی رائے کیا دوں؟ ایسے عالم اور ایسے محتاط عالم کے کلام پر رائے دِہی، سہل نہیں۔ بہتر ہوتا کہ اِس نظری کلام کو پہلے الگ سے شائع کیا جاتا۔

.....

میرے والد صاحب اور اُن کے کاموں سے متعلق حقی صاحب نے جو کچھ فرمایا، میں نے اُسے جلدی میں اور بہت اختصار سے لکھا تھا لیکن ابھی اِسے مکمل طور پر غیر مرموز کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ اِس لیے ابھی صرف وہی لکھا ہے جس کے بارے میں سہو ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ اندازے سے کچھ لکھ دینا دونوں مرحومین کے ساتھ بددیانتی ہوگی۔ ایک یادگار جملہ البتہ یہاں ضرور محفوظ کرنا چاہوں گا جو اُنھوں نے میرے یہ کہنے پر کہ میرے والد صاحب کی طبیعت شہرت سے نفور تھی، ارشاد فرمایا تھا، کہ حافظ صاحب! سستی چیزیں آواز لگا کر بیچی جاتی ہیں، ہیرے جواہرات کو پھیری والے نہیں بیچا کرتے۔

ماہنامہ شاعر (انڈیا) کے شان الحق حقی صاحب کی خدمات کے اعتراف میں شائع ہونے والے خصوصی شمارے (ستمبر ۲۰۰۵ء) میں اُن کا ایک مکالمہ شائع ہوا ہے جو اُن کی زندگی کا بھی آخری مکالمہ ہے۔ اِس میں اُنھوں نے ''کوئی قابلِ ذکر کتاب، شخصیت؟'' کے جواب میں دو کتابوں کے نام لیے ہیں: ایکرمن سے گوئٹے کے مکالمے، ترجمہ جان آکسفرڈ، اور مغرب میں آزاد نظم۔ ''شخصیت'' پر اُن کا جواب تھا: پروفیسر عابد صدیق مرحوم۔

میں شان الحق حقی صاحب اور شاعر کے مدیر جناب افتخار امام صدیقی صاحب دونوں کا شکر گزار ہوں۔

☆

حقی صاحب نے مرحوم مشفق خواجہ صاحب پر لکھے میرے مضمون The Passing of the Old Guard کو بہت سراہا اور کئی بار اِس کا تذکرہ فرمایا۔ اِس پسندیدگی کی سند کے طور پر اُنھوں نے اردو اکادمی بہاول پور کے ترجمان سہ ماہی الزبیر کو الگ سے اردو میں خط لکھا اور مجھے بھی باقاعدہ اور طویل برقیاتی خط اِرسال کیا۔ صرف ایک ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:

> عزیزم حافظ صفوان محمد چوہان کی وساطت سے مجھے آپ کے مؤقر جریدے کو ایک مدت بعد دیکھنے کا موقع ملا۔ مندرجات اور بھی بہت اچھے ہیں، اور جریدے کا پایہ ماشاءاللہ خاطر خواہ معقول، متین اور قابلِ ستائش ہے۔ لیکن میں اِس وقت صرف ایک مضمون کے بارے میں چند کلماتِ تحسین رقم کر رہا ہوں کہ مناسب وقت ہے اور واجب بھی، یعنی حافظ صاحب موصوف کے کلماتِ خیر مشفق خواجہ کے تعلق سے۔ شرکتِ غم کے علاوہ اُن کے طرزِ نگارش نے بھی اِس تحریر پر آمادہ کیا، جو خود تو ادب نگاری کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتے، مگر منہ سے بولتے

ہوے خلوص اور بے تکلفانہ سادگی کی بنا پر متاثر کرتے ہیں۔موصوف ایک جلیل القدر استاد کے سعادت منداور اپنی جگہ لئیق فرزند ہیں، اور ایک پیکرِ خلوص۔ میں اُن سے ابھی تک ملا نہیں لیکن امید رکھتا ہوں کہ ملاقات سے محروم نہ رہوں گا۔.....

Dear Hafiz sahib, ASA wa rahmatullah. I appreciate your sentiments about Mushfiq and largely share them with you. Your writing is good enough. You don't have to be shy about it. Only try to be brief…..

میری سعادت ہے کہ اُنھوں نے اِشاعت سے پہلے اِس مضمون کو دیکھا تھا اور کچھ واقعاتی اور محاورے وغیرہ کی غلطیاں دور کرا کے اِسے نگ سِک سے درست کرایا تھا۔

.....

حقی صاحب مجھ سے میرے مشاغل کے بارے میں بھی باتیں کیا کرتے تھے۔ میرا ایک پرانا شوق آٹوگراف جمع کرنے کا بھی ہے۔ جنابِ مختار مسعود کی آوازِ دوست تو میں نے بہت بعد میں پڑھی لیکن آٹوگراف کے سلسلے میں کڑا اِنتخاب شروع ہی سے میرا مزاج رہا ہے۔ اِس کتاب سے مجھے بہت مدد ملی اور آٹوگراف کے لیے میرا چناؤ مزید واضح ہوتا چلا گیا۔مختار مسعود صاحب نے ایک ''بَن بُلائے'' آٹوگراف کا ذکر کیا ہے۔ کتابِ مذکور میں دو مضمون ہیں: اوّل مینارِ قراردادِ پاکستان کی تعمیر سے صاحبِ کتاب کا تعلق اور دوم یہ آٹوگراف۔ اگر مجھے دونوں مضامین میں سے ایک ایک بات ذکر کرنے کو کہا جاے تو میں پہلے مضمون میں سے وہ پیراگراف پیش کروں گا جس میں عالمگیری مسجد کے مینار نے اُن سے سرگوشی کی ہے اور دوسرے سے یہ نوحہ پڑھوں گا جو ایک بَن بُلائے آٹوگراف کی دراندازی پر اُنھوں نے لکھا ہے۔ میرے آٹوگراف البم کے ساتھ بھی دو تین بار ایسا ہی سانحہ ہوا ہے۔ ایک مَثل مشہور ہے کہ زبان کا گھاؤ تلوار کے گھاؤ سے گہرا ہوتا ہے۔ مثل میں ترمیم پیش ہے کہ زبانِ قلم کا گھاؤ بھی تلوار کے گھاؤ سے گہرا ہوتا ہے۔

میرا یہ شوق عمر کے بارہویں سال سے چل رہا ہے۔ میں نے کچرا جمع نہیں کیا: ابھی تک میرا البم تین چوتھائی سے زیادہ خالی ہے۔ اب تو بعض اوقات کئی کئی سال تک ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملتا جسے اپنے اِس دروں خانے میں جگہ دے سکوں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کسی بڑے آدمی کے آٹوگراف کے لیے کئی جتن کر کے اُس تک پہنچا لیکن قریب پہنچ کر اُس بڑے نام کا یہ آدمی تو نظر نہ آیا البتہ کوئی بڑا جانور یا گزندہ ضرور دکھائی دیا۔ اب ظاہر ہے کہ میں آٹوگراف البم میں کسی جانور کے کُھر یا کسی گزندے کے پنجے کے نشانات تو نہیں رکھ سکتا۔

میرے آٹوگراف البم کا حاصل حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ سندِ حدیث ہے جو اُنھوں نے اِس ناکارہ کو ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں ۱۱/فروری ۱۹۹۰ء کو بڑی دینی شخصیات کی موجودگی میں دستِ خاص سے تحریر فرما کر یہ ارشاد فرماتے ہوئے عطا کی تھی کہ: ''تم سب لوگ گواہ رہنا کہ میں نے عابد صدیق کے بیٹے حافظ صفوان محمد کو حدیث کی یہ سند اور خصوصی اجازت دی ہے۔''

میں جن لوگوں سے کسی وجہ سے مل نہیں سکتا اور اُن کا آٹوگراف لینا میری ترجیح ہوتا ہے، میں اُن کو خط لکھ کر جواب مانگا کرتا ہوں۔ یہ جواب آٹوگراف کی بہترین شکل ہوتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے پاس آٹوگراف کا ایک رنگارنگ خزانہ ہے جس میں منتخب اکابرِ دین، چند اہم ملکی اور بین الاقوامی شخصیات کے خطوط اور کئی ایک دستخطی تصاویر موجود ہیں۔ میری فرمائش پر حقی صاحب نے مجھے مارچ ۱۹۹۱ء میں ایک غزل آٹوگراف کے طور پر اپنے لیٹر پیڈ پر لکھ کر عنایت فرمائی تھی جس کا مطلع ہے: ؎

ڈر جاؤ گے بشر کا جو چہرہ دِکھائی دے
اچھا اُسی کو جانو جو اچھا دِکھائی دے

اور پھر، آخری دنوں میں اُنھوں نے ایک تصویر پر دستخط ثبت کر کے اور ایک بہت ہی خوب صورت پھولوں والے کاغذ پر اپنے کئی اشعار لکھ کر مجھے ڈاک سے بھیجے۔ اِن میں کا ایک شعر ہے: ؎

اِک مہک سی دمِ تحریر کہاں سے آئی
نام میں تیرے یہ تاثیر کہاں سے آئی

ایک بار میں نے معذِرت بھی کی کہ میں اپنی اِس قسم کی خواہشات سے آپ پر بوجھ ڈالتا رہتا ہوں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ آپ کی فرمائشیں پوری کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ بھلا کبھی پلکیں بھی آنکھوں پر بوجھ ہوتی ہیں؟

برقیاتی خط کے ایک اور اقتباس پر اپنی ذات سے متعلق چل پڑنے والے اِس موضوع کو ختم کرتا ہوں جو اُنھوں نے میرے تبلیغ سے تعلق اور مشاغل کا علم ہو جانے پر اور لغات ولسانیات پر چلنے والی بحثوں کے ایک طویل سلسلے کے بعد ایک موقع پر مجھے بھیجا تھا:

Dear Hafiz Sahib,..... You are an admirable person having the right kind of preference in life and qualities of head and heart which should stand you in good stead. You have all the best wishes from me and I do see a promising future for you.....

حقی صاحب بہت وضع دار، نژادہ، روشن نہاد اور نباہ کرنے والے آدمی تھے، اور شمع کی مانند کہ جس کا رو پشت برابر ہوتا ہے۔ دستِ خود، دہانِ خود کے قائل اور نہایت غیور تھے۔ بے کار ہو جانے سے خائف تھے۔ آخری عمر میں بچوں کے ہاں رہنے پر آزردہ تھے۔ میں نے کتابیں اِرسال کیں تو چیک دِیے بنا کوئی بات بھی کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اپنے آپ کو پیچھے رکھتے اور ہما ہمی سے بچتے تھے۔ حفظِ مراتب کا خیال رکھنے اور حقوق العباد کی اَدائی کے معاملے میں وہ اِس دور کی نادر مثالوں میں سے تھے یعنی سیرتاً انتہائی اچھے مسلمان- جو فی زمانہ کتابوں کے علاوہ خال خال ہی میں ملتے ہیں۔ لمبی لمبی گفتگوؤں کے باوجود میں نے اُنھیں کبھی ماضی گرفتہ (Nostalgic) نہیں پایا۔ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ وہ علی العموم ماضی پر بات چیت کرتے ہی نہیں تھے۔ میں نے اُنھیں کبھی خود رحمی کا شکار ہوتے یا اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں پر لب گزاں ہوتے تو کجا، لبِ گفتار تک وا کرتے نہیں سنا۔ سلمٰی حقی صاحبہ نے بھی لکھا ہے کہ: ''.....کراچی کی نام نہاد علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے بوالعجب کارکنوں نے اپنے کسی مشاعرے میں اُن [حقی صاحب] کو نہیں بلایا، حالاں کہ اُن کا علی گڑھ سے پشتینی تعلق ہے۔.....مگر اُنھوں نے کبھی اِس کی شکایت نہیں کی کہ کیوں نہ بلایا۔''

اپنے سالہا سال پر محیط اور خاصی حد تک بے تکلفانہ تعلق کے باوجود میں نے اُن سے کسی بھی آدمی کے بارے میں کوئی ہلکا لفظ، کبھی نہیں سنا۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ ''بے مثال'' شہرت کی حامل ایک ادبی شخصیت (بے مثال اِس لیے کہ دوسروں کے کیے ہوئے کام اپنے نام سے شائع کرانے کی علت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اُن کی شہرت کے ڈانڈے رسوائی سے ملے ہوئے ہیں) کا نام سنتے ہی فرمایا کہ ''بھئی! وہ تو بوگس آدمی ہے۔'' یہ جملہ بھی اِسی لیے منہ سے نکل گیا ہوگا کہ وہ صاحب ایک وقت میں باقاعدہ طور پر حقی صاحب کی ماتحتی میں کام کرتے رہے تھے۔ اِس ایک مختصر جملے کے علاوہ میں نے اُن سے کسی کی ذات پر کوئی تبصرہ نہیں سنا۔ غیبت کو گناہ سمجھنے والے لوگ میں نے بہت کم دیکھے ہیں؛ حقی صاحب ایسے ہی زمین کا نمک لوگوں میں سے تھے۔

اُن کا آخری زیرِ ترتیب مجموعۂ کلام نوائے سازِ شکستہ (کلیاتِ غزلیات) کتابت خوانی کے بعد کچھ عرصہ کے لیے لاپتا ہو گیا۔ اِس کی ڈھنڈیا پڑی کو جب خاصا وقت بیت چکا تو ہم لوگ کچھ لوگوں کو موردِ گم شدگی ٹھہرانے لگے لیکن حقی صاحب برابر اِسی پر اِصرار کیا کیے کہ ایسی بات نہیں ہے۔ آخر کو اُن کا حسنِ ظن ہی رنگ لا کر رہا۔

اپنے والد کی طرح حقی صاحب بھی بہت دیانت دار اور اُصولی آدمی تھے۔ ایک بار مولانا اسمٰعیل ذبیح

صاحب نے اُن سے برہمن میکیاولی چانکیہ کے ارتھ شاستر کا ترجمہ کرایا اور اُجرت کا چیک دے دیا۔ حقی صاحب نے یہ ترجمہ سنسکرت سے براہِ راست کیا۔ اِشاعت کا وقت آیا تو وہ اِسے حقی صاحب کے نام سے چھاپنے پر آمادہ نہ تھے۔ حقی صاحب نے مختانہ یہ کہتے ہوے واپس کر دیا کہ اُجرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مترجم کا نام بھی خرید لیا جاے۔

حقی صاحب نے ساری زندگی اردو کا کارکن بن کے گزاری۔ یہاں تک کہ آخری زندگی میں جب کہ بڑے بڑے وضع دار، ادب دار لوگ بھی کوسِ لِـمَنِ المُلک بجانے لگتے ہیں، وہ صرف کارکن ہی بن کر رہے۔ آکسفرڈ کا جامع اردو-اردو لغت اِس پر گواہ ہے؛ اور اُن کی وفات پر امینہ سید صاحبہ کا ڈان میں چھپا ہوا خط بھی یہی بتا رہا ہے۔

☆

انٹرنیٹ پر گپ شپ (chatting) کرتے ہوے حقی صاحب عموماً بہت خوش گوار موڈ میں ہوتے تھے؛ اور یہ گفتگو اِنے گنے چند موضوعات پر نہیں بلکہ وہ دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ میں ڈرتا تھا کہ اتنے بڑے آدمی سے ہلکی پھلکی باتیں اور بے تکلف گفتگو کی جاے لیکن وہ خود ہی کوئی ایسا لفظ یا جملہ درمیان میں لے آتے تھے جس سے بعد کی گفتگو مزاح سے عبارت ہو جاتی تھی۔ کئی بار اُنھوں نے خود کو بڈّھا طوطا کہا، اور پھر بڈّھے طوطے سے متعلق روایتی چھوٹ سے خوب خوب فائدہ اُٹھاتے اور لطف لوٹتے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ میں بڑا بدّھو ہوں۔ ہنسے۔ کہنے لگے کہ اپنے بارے میں اِس قسم کا سچ نہیں بولنا چاہیے۔ پھر کہنے لگے کہ اکثر والدین بچوں کو بدّھو ہی سمجھتے ہیں اور اُنھیں بھی بچپن میں اُن کے والد بدّھو ہی سمجھا اور کہا کرتے تھے۔ اِس پر میں نے عرض کیا کہ کلاں اردو لغت میں آپ کو اِس لفظ کی بیسویں صدی کے نصفِ اوّل کی سند میں یہ حوالہ شامل کرنا چاہیے تھا۔ کہنے لگے کہ واقعی، بھول ہوگئی۔ ویسے میں اگر بھول نہیں رہا تو میرا ایک نام بھائی بھلکڑ بھی ہے۔ پھر اِس نام سے متعلق کئی مزے کی باتیں بتائیں۔

ایک بار بات چلتے چلتے کسی طرح لیڈی ڈیانا کے کوچے اور سراپے تک جا پہنچی۔ میں بہت خفیف ہوا، لیکن اُنھوں نے بڑھاوا دیا۔ میں نے کہا کہ میں ڈیانا کو ''سیدہ ڈیانا رحمۃ اللہ علیہا'' کہا کرتا ہوں۔ اُنھوں نے حیرت و شوق سے ''مرحومہ'' پر میری اِس عنایت کی وجہ دریافت کی۔ عرض کیا کہ وہ بے چاری آخری وقت میں ایک مسلمان کے ساتھ تھی اور اُس کے ساتھ حادثے میں ''شہید'' ہوئی۔ پوچھا کہ یہ شہادت کی کون سی قسم ہوئی؟ میں نے کہا کہ اگر نعرے لگاتا ہوا یا نعرے لکھ لکھ کر دیواریں کالی کرتا ہوا ایک آدمی گولی لگ کر مر جاے تو ''شہید'' کہلا سکتا ہے تو ایک

مسلمان کی محبت میں اُس کے ساتھ جان دینے والی خاتون کیوں ''شہید'' نہیں ہوسکتی۔ میں نے آخری جملہ یہ بھی کہہ دیا کہ ویسے بھی اپنا ''نیک گمان'' یہ ہے کہ اتنی خوب صورت چیز کو اللہ جہنم کا ایندھن نہیں بنائے گا، کہ یہ خوب صورتی بھی تو اُسی کی عطا کردہ تھی۔ وہ اِس بے تکی منطق سے بہت دیر تک حَظّ لوٹتے رہے۔ (رفعِ شر کے لیے عرض ہے کہ اِس وقت یکم مئی کی چھٹی کے حوالے سے شکاگو کے مزدور ''شہداء'' کا ذکر چل رہا تھا۔)

اِس بات کا ذکر بھی کیے دیتا ہوں کہ حقی صاحب نے اپنے تہذیب اور وضع داری کے نشانات انٹرنیٹ پر اِس گپ شپ میں بھی چھوڑے۔ وہ بات ہمیشہ سلام سے شروع کرتے اور سلام اور ''پھول'' پر ختم کرتے۔ بات شروع کرنے سے پہلے ہمیشہ یہ دریافت کرتے کہ کیا میرے پاس اُن سے گفتگو کرنے کے لیے وقت ہے؟ مختصر ترین بات چیت میں بھی اُنھوں نے اِس ''اخلاقیات'' کو ہمیشہ نبھایا۔

☆

پہلی بار جب میں مشفق خواجہ صاحب کے ہاں گیا تھا تو باتوں باتوں میں اُن سے پوچھا کہ اُنھوں نے کس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ وہ بہت ہنسے۔ فرمانے لگے کہ اب تو ادبی موضوعات پر پی ایچ ڈی عموماً قینچی، گوند اور فوٹو کاپی مشین سے ہوجاتی ہے، اور یہ کہ وہ اِس ''تہمت'' سے محفوظ ہیں۔ اِس بات کا ذکر میں نے حقی صاحب سے بھی کیا۔ ایک بار میں نے اُن سے پوچھا کہ اُن کی پی ایچ ڈی کا موضوع کیا تھا۔ اُن کا انکار سن کر میں حیران ہوا اور پوچھا کہ آپ کے عطا کردہ گلدستۂ نگارش پر تو آپ کے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' کا لاحقہ بڑے زور شور سے لگا ہوا ہے۔ جواب ملا کہ یہ اِس وجہ سے ہے کہ چند لوگ اُن کے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' لگا دیکھنا چاہتے تھے۔ اِن لوگوں کے نام نہ میں نے پوچھے، نہ اُنھوں نے بتائے۔ عیاں را، چہ بیاں؟

.....

حقی صاحب کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز بھی ملا۔ وہ نعمتوں کی ناقدری کرنے والے انسان نہیں تھے لیکن اُنھوں نے کبھی اپنے نام کے ساتھ اِس اِعزاز کا لاحقہ نہیں لگایا۔ کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کو سرکاری اِعزازات کا مل جانا درحقیقت اِن اِعزازات کی اپنی توقیر ہوتی ہے- اور اِس بات میں دورائی نہیں ہوسکتی کہ حقی صاحب کی ذات اِنھی میں سے ایک ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اِعزاز یافتگان اپنے نام کے ساتھ فخر سے اِن کا لاحقہ لگایا کرتے تھے۔ اب اِن میں کے کچھ تو خود لوگوں سے منھ چھپاتے پھرتے ہیں اور کچھ سے لوگ۔ مرورِ زمانہ نے اب تو یہ حال کردیا ہے کہ اِعزازات کی یہ ریوڑیاں زیادہ تر پچھلے دروازے سے ہی بٹتی اور تقسیم ہوتی ہیں اور اِن

کی اوقات اُن ٹھیکریوں جتنی بھی نہیں رہ گئی جن سے ہمارے زمانے میں بچے ''پٹھو گرم'' کھیلا کرتے تھے!

یوں بھی، اِن پامال پیمانوں سے حقی صاحب جیسے ادب ولغت کے روشن مینار (lighthouse) کی بلندی اور تابندگی (luminosity) کو ناپنا، ناسپاسی ہے۔

☆

حقی صاحب نے سہ ماہی الزبیر کے شِہاب دہلوی نمبر کے لیے شِہاب صاحب پر ایک مضمون بھی تحریر کیا تھا۔ ایک بار اُنھوں نے مجھے لکھا کہ آفرین ہے کہ ایک چھوٹے شہر سے ایک خالص ادبی رسالہ اِس قدر باقاعدگی سے اور اشتہارات کے بغیر شائع ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے اپنے آخری مکالمے (ماہنامہ شاعر؛ محوّلۂ بالا) میں قابلِ ذکر ادبی رسالوں کے ذیل میں صرف الزبیر کا نام لیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قدردانی الزبیر کے تقریباً نصف صدی پر محیط دور میں اِسے اب تک ملنے والا سب سے بڑا اِعزاز ہے۔ الزبیر کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔

.....

حقی صاحب نے اپنے الف اور ب کی نوک جھوک کے مشہور سلسلے کی تحریروں کے انتخاب نوک جھوک کے لیے تعارفی تحریر اور فلیپ لکھوانے کا کام میرے ذمے لگایا اور فرمایا کہ وہ اِس سلسلے میں وزیر آغا صاحب کو ایک خط لکھ چکے ہیں۔ میرے رابطہ کرنے پر آغا صاحب نے بہت ہی جلد یہ تعارفی کلمات لکھ کر مجھے بھیج دِیے۔ میں نے اِنھیں اردو لفظ نگار کے مرحلے سے گزار کر حقی صاحب کی خدمت میں برقیاتی خط سے منسلک کر کے روانہ کر دیا۔ زبان آوری کا نادر لیکن انتہائی شاداب مرقع یہ کتاب فیروز سنز سے شائع ہو چکی ہے۔ میں آغا صاحب کا شکر گزار ہوں۔

☆

عزیزم ناصر جاوید صاحب بھی آخری دنوں میں حقی صاحب کے ساتھ مستقل رابطے میں رہے اور اُن کے کراچی سے متعلق کئی کام، بالخصوص ایک شعری مجموعے کی اشاعت سے متعلق بھاگ دوڑ، نہایت تن دِہی سے اور اپنی سعادت سمجھ کر کرتے رہے۔ ناصر، اپنی ہنس مکھ شخصیت اور لوگوں کے کام آنے والی کم یاب خوبی کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ مشفق خواجہ صاحب کے ادبی دودمان کے خادم بھی ہیں۔ حقی صاحب بھی اُن کی اِس حیثیت کی وجہ سے اُن کو کئی کاموں کا اہل جان کر اُن سے رابطہ کرتے رہے، اور اُن کو اپنی محبتوں اور شفقتوں سے نوازتے رہے۔ ناصر صاحب کی شبانہ روز محنت سے مشفق خواجہ صاحب کی لائبریری، جو مرحوم کی اجازت سے کراچی میں شکاگو یونیورسٹی کا تحقیقی مرکز بننے کی راہ پر رواں ہے، سے متعلق معلومات اب انٹرنیٹ پر بھی موجود ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

http://www.lib.uchicago.edu/e/su/southasia/mushfiq_khwaja/

- ۸ -

ایک بار میں نے حقی صاحب کو ایک طویل خط لکھا جس میں جی کڑا کر کے اِس بات کا تفصیلاً ذکر کیا کہ فلاں صاحب نے آپ سے متعلق مجھے ایسی اور ایسی ناگفتنی باتیں کہی ہیں۔ آفرین ہے اُن پر، کہ اُسی رات میں نے فون کیا تو اُنھوں نے سب سے پہلے اُنھی صاحب کی صحت کا پوچھا اور پھر اُن کے بارے میں کلماتِ خیر ارشاد فرمائے، اور اِن لگتی لگاتی باتوں کا تذکرہ تک نہ کیا۔ (لمبی کہا کہی والے اِس موضوع پر میرا ارادہ جم کر لکھنے اور حقی صاحب کے طویل جوابی برقیاتی خط سے چند اِقتباس دینے کا تھا لیکن میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب کی ہدایت پر قلم کو روک رہا ہوں۔)

حقی صاحب کے بارے میں یہ بات بھی میرے علم میں لائی گئی کہ وہ شعائرِ اسلام کے بارے میں آزاد زبان استعمال کرتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں نے اُن کی جتنی تحریریں پڑھی ہیں اُن سے مجھے اِس بات کی تصدیق میں شمہ برابر بھی مواد نہیں ملا۔ اِس کے برعکس مجھے تو اُن کی نظم ونثر میں کچھ ایسے علائم یوں بھینی بھینی خوشبو بکھیرتے ملے ہیں جن سے ایک گہرے دینی علم اور مذہبی ثقافت سے محبت کے رسا بسا ہونے کا صاف پتا ملتا ہے۔ اپنی اِس بات کو وزن دار بنانے کے لیے میں اُن کے صرف ایک شعری مجموعے سے صرف دو اشعار اور نثر سے بھی صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ حرفِ دل رس سے ایک شعر دیکھیے: ؎

بہت ہوتا ہے مے خواروں پہ برہم
پلاؤ شیخ کو پانی وضو کا ص۸۶

اِس شعر کے حاشیے میں بیگم سلمیٰ حقی نے لکھا ہے کہ وضو کا بچا ہوا پانی غصے کو کم کرنے کے لیے پلاتے ہیں۔ ایک شعر میں ایک اور حدیثِ پاک کا حوالہ دیکھیے: ؎

تھا بہت مانوسِ زنداں گرچہ دیوانہ ہی تھا
قصۂ دنیا بھی میرے دل کا افسانہ ہی تھا ص۱۲۷

مرقوم الحاشیہ ہے کہ یہاں حدیثِ پاک اَلدُّنیَا سِجنُ المُومِنُ کی طرف اشارہ ہے، کہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔

نثر سے پہلی مثال لسانی مسائل و لطائف سے پیش ہے۔ اردو کے لیے رومن حروف کو بقدرِ ضرورت استعمال کرنے کی اِباحت اور اِس بارے میں متشددانہ رویے پر نظرِ ثانی کیے جانے کی بحث کو سمیٹتے ہوے حقی صاحب نے اپنے مقالے رسم الخط کی الجھن میں لکھا ہے کہ:

> .....اخذ و ترک میں سے کون سی چیز بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اخذ میں فائدہ ہے، ترک میں نقصان۔ ہمارے لیے ''ترکِ ترک'' ہی بہتر ہے۔ (صوفیہ کی ارواح سے معذرت کے ساتھ) ہم نہ ترکِ دنیا کر سکتے ہیں نہ ترکِ عقبیٰ۔ دونوں جہان بخیر رہنے چاہییں۔ لہٰذا اردو کے ساتھ ساتھ جہاں ضرورت ہو، رومن سے بھی کام لینا لازم ہے۔

مقاماتِ سلوک کو جاننے والا کوئی اللہ کا بندہ اِس اقتباس کو پڑھ کر وجد میں آئے بغیر بلکہ پھڑ کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ (یہاں میں یہ اعتراف کروں گا کہ میرے ذہن میں ایک نثری اقتباس حقی صاحب کے مقالے اکبر کا فنِ ظرافت سے لینے کا تھا لیکن خدا لگتی کہوں تو یہ مقالہ پورا کا پورا ہی درج کرنا پڑتا۔)

نثر سے دوسری مثال کوئے آشنا سے پیش ہے۔ قیامِ علی گڑھ کی یادنگاری کرتے ہوے حقی صاحب نے اپنے اِس مضمون جسے اُنھوں نے شروع ہی اِس مزے دار جملے سے کیا ہے کہ: ''اپنے بارے میں لکھنا ہو تو ممیانا بہت پڑتا ہے.....'' میں اُن شخصیات کا ذکر کرتے ہوے جنھوں نے اُن کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یونین ہال میں خطاب کیا، امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے:

> .....خیر، تقریر کے فن کا کوئی جادوگر تھا تو یادَش بخیر و نامَش بسلامت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ اُن کی تقریر کیا تھی ایک رنگارنگ تماشا تھی جس میں وعظ بھی شامل تھا، بحث و استدلال بھی، اداکاری بھی، قصہ گوئی و لطیفہ طرازی بھی، اشعار بھی، لحن بھی، پیار بھی، پھٹکار بھی۔ اردو، پنجابی، ہندی، فارسی، عربی، سب کچھ۔ اور اندازِ گفتار میں ایسی گرفت کہ تقریر عشا کے بعد شروع ہوتی تو فجر کی آذان تک بھی چلتی مگر کوئی کھڑا ہو یا بیٹھا، کیا مجال جو مجمع میں سے سرک جاے۔ واضح رہے کہ اِن جلسوں میں مائکروفون کا پتہ نہ تھا مگر میرے کانوں میں آج بھی اُن کی آواز اِسی طرح گونج رہی ہے جیسے ایمپلی فائر میں سے نکلی ہو۔ کبھی شیر کی طرح گرجتے کبھی پھوار کی طرح برستے۔ علی گڑھ کے یونین ہال میں اُن سے فرمائش کی گئی کہ قادیانیوں کے خلاف کچھ نہ کہیے گا۔ کوئی دو گھنٹے بولے۔ احمدیوں کا واقعی نام نہیں لیا۔

لیکن چھینٹے اُن پر بھی اُڑاتے رہے اور تان بھی اِسی مضمون پر توڑی۔ کسی حکایت کا ایک آخری ٹکڑا تھا کہ ماں نے تو آخری لڈو اپنے چہیتے لال کو دے دیا تھا۔ بعد میں جو کوئی مانگتا ہوا پہنچا تو اُس نے دامن جھٹک دیا کہ میرے پاس اب لڈو کہاں؟ اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی. بس اِسی آیت پر تقریر ختم ہوگئی۔ ممکن ہے بات بے تکی معلوم ہو۔ لیکن یہی تو تقریر کا جادو ہے کہ مجمع پھڑک اٹھا۔ اِس سے بڑھ کر کمال یہ کیا کہ جھوٹ کی مذمت میں تقریر کی اور حاضرین سے عہد لیا کہ کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے۔ طالب علموں نے بڑی سادگی سے ہاتھ اُٹھا دیے۔ اِسے کہتے ہیں سٹی گم کر دینا۔ پڑھا لکھا ذہین طبقہ ذرا تو سوچتا کہ کہاں تک اِس عہد کو نباہ سکے گا۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حقی صاحب نے اِس مضمون جس میں بہت سے لوگوں کا ذکر ہے، میں سب سے طویل تذکرہ حضرت امیرِ شریعتؒ ہی کا کیا ہے۔ ایک بار اُن سے chatting پر حضرت امیرِ شریعتؒ کے بارے میں بات ہوئی تو فرمایا کہ اُنھیں کئی بار شاہ جیؒ کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُنھوں نے مجھے شاہ جیؒ کے سراپے اور وضع قطع کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں اور فرمایا کہ میں نے کچھ عرصہ پہلے ایک مضمون میں اُن کی ایک تقریر کے بارے میں کچھ لکھا بھی ہے۔ بحمداللہ یہ مضمون مجھے جلد مل گیا، اور آج اِس سے اقتباس کا موقع بھی بن گیا۔

اور تو اور، حقی صاحب کے مرتّبہ فرہنگِ تلفظ جیسے یک جلدی لغت میں بھی مجھے ہر ایسے اِندراج جس میں کسی بھی مذہب پر معلوماتی مواد ڈالا جا سکتا تھا، بڑے اہتمام کے ساتھ اِسے کھپایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کے اصل اندراج اور تحتی الفاظ/تابعات میں ہندی کے ساتھ ساتھ عربیت و فارسیت کا اہتمام اِس کے سوا ہے۔

اللہ نے سود کو حرام اور معیشت کو حلال کیا ہے۔ گردشِ ایام نے مسلمانوں کی ایسی مت ماردی ہے کہ اِن میں کے عقل والے لوگ بھی حیران ہو گئے ہیں اور اَنٹ شنٹ دلائل سے سود کو حلال کرنے میں لگے ہوے ہیں۔ (یاد رہے کہ یہاں ''حلال'' کا لفظ ''جائز قرار دینا'' کے معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے، ''ذبح'' کے معنٰی میں نہیں۔) آپ حقی صاحب کی نوک جھوک میں مضامین ''کیا کھویا کیا پایا''، ''روپے کی صورت'' اور ''معیشت'' پڑھ جائیے، سود کے حرام ہونے اور نتیجۃً معاشرے کا چہرہ بگاڑ دینے پر اِس سے مضبوط دلائل آپ کو کہیں نہ ملیں گے۔ ''رشدی کو معافی'' میں آپ کو پتہ ملے گا کہ کس طرح ابوالمعالی خلیقی دہلوی مرحوم جیسے اچھے خاصے عالم آدمی کا پوتا اِس لیے ایک ایسی کتاب لکھ بیٹھا کہ اُسے اپنی قوم کا مزاج ہی معلوم نہ تھا، اور یہ کہ اُسے اپنی قوم یعنی ہندی مسلمانوں کے ماحول

سے دور رکھنے میں خود اِن مسلمانوں کو کتنا دخل ہے۔ ''ایک ناتمام مناظرہ'' اور ''لطائف المؤمنین'' میں بڑے مزے دار اُسلوب میں مسلمانوں کے لطیفے سنائے گئے ہیں جن پر ہنسنا نہیں رونا آتا ہے جیسے مثلاً چھاپے کی مشینوں پر قرآن وحدیث کی اِشاعت کے خلاف مفتیِ اعظم کا فتویٰ، کہ ہم کاتب کا ہاتھ پکڑ سکتے اور گرن ناپ سکتے ہیں، مشین سے کیا مواخذہ کریں گے؟ جرمن زرگر Gutenberg دنیا کا پہلا چھاپہ خانہ ۱۴۵۰ء سے پہلے بنا چکا تھا؛ چناں چہ پہلا قرآن اٹلی میں عیسائیوں نے چھاپا جب کہ مسلمانوں نے ساڑھے تین صدیاں گزرنے کے بعد ۱۸۰۵ء میں! تحریکِ خلافت کو حقی صاحب نے ایک جملے میں یوں سمو دیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر برطانیہ کی حکومت (یعنی عیسائیوں) پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ خدارا ہماری خلافت کو بچاؤ جسے ترک مسلمانوں نے ختم کر دیا ہے۔

دراصل حقی صاحب کا ایک خاص رویہ تھا جس کی بنا پر اِس قسم کی آوازیں سننے کو ملیں۔ ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس سے بات واضح ہو جائے گی: ایک بار میں نے پوچھا کہ آپ کا چہرہ دیکھ کر تو پرانے مسلمان یاد آتے ہیں، جب کہ آپ نے ڈاڑھی کے بارے میں کہیں فرمایا ہے کہ اِس لیے رکھی ہے روزانہ کیا گھس گھس کروں۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ میں اپنے اِس عمل کو موضوعِ بحث نہیں بنانا چاہتا تھا اِس لیے ایک جملہ کہہ کر بات کو ختم کر دیا۔ کہیے! میری ڈاڑھی کہیں موضوعِ گفتگو بنی ہے؟

اِس موضوع کو اِس بات پر ختم کرتا ہوں کہ میں نے ایک عرصے تک حقی صاحب کے امت کے سوادِ اعظم سے لگّا نہ کھاتے ہوئے خیالات کو ڈھرے پر لانے کی ایک سَمُت بند کوشش کی اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اِس میں ظفر مند ہوا۔ اُن کا یہ جملہ کہ ''لفظ کا چلن اُس کے فصیح تلفظ پر حاوی ہو جاتا ہے،'' میں نے اُن کے ہر ایسے خیال کے بارے پیش کیا جو غریب تھا: نمازوں کی تعداد کے بارے میں اصحابِ ظواہر والا نظریہ، مردوں کو دفنانے کی بابت خیالات، وغیرہ وغیرہ- غرض ہر چیز کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے برابر چلن میں ہونے کی دلیل اُن کے ہر ایسے خیال کی نفی کرتی رہی۔ اِس کام میں کئی مہینے لگ گئے۔ حقی صاحب اِس بات سے خوش تھے کہ میں نے اُن کو اُنھی کی لائن سے لیا ہے۔ میں نے جب آخری بار اُن سے فون پر بات کی تو کئی باتوں کے علاوہ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

> حافظ صاحب! اب آفتابِ زیست لبِ بام آ گیا ہے۔ آپ اطمینان رکھیے اور گواہ رہیے کہ میں اپنے اَسلاف کے مسلک پر ہوں۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ اللہ نے یہ کام میرے ہاتھ سے کرایا ہے۔ اِس پر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

- ۹ -

بیگم سلمیٰ حقی نے اپنے مضمون وہ اور اُن کی شاعری میں حقی صاحب کے بھلکڑ پن کا تذکرہ کرتے ہوئے اختتامی جملہ (closing sentence) یہ لکھا ہے کہ: ''اُن کے بھلکڑ پن کے باوجود ہم پھر بھی اُن کی یادداشت کے قائل ہیں کہ وہ ہمارے گھر آنا کبھی نہیں بھولتے۔'' ایک بیوی کا اپنے شوہر سے متعلق یہ جملہ ناز و محبت کا ہر پہلو سموئے ہوئے ہے۔ اِس جملے نے مجھے تو لوٹ ہی لیا۔

شان الحق حقی صاحب ۸/ رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ موافق ۱۱/ اکتوبر ۲۰۰۵ء یعنی رمضان کے عشرۂ رحمت میں کینیڈا کے وقت کے مطابق صبح ۰۴:۲۵ پر اللہ کے حضور حاضر ہوئے۔ کینسر کے بدن میں پھیل جانے کی وجہ سے آخری دنوں میں بات کرنا ممکن نہ رہا تھا اِس لیے لکھ کر بات کرتے تھے۔ ۱۴/ اکتوبر کو جامع مسجد ISNA مسی ساگا میں بعدِ نمازِ جمعہ ۱۴:۳۰ پر اُن کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور Glenoke Memorial Garden میں اپنی اہلیہ کے پہلو میں سپردِ خاک کیے گیے۔ قبر کچی اور بالکل ہموار ہے۔ شایان صاحب نے بتایا کہ جب حقی صاحب کے لیے قبر کھودی گئی تو درمیان کی آڑ گر گئی اور مرحومہ سلمیٰ حقی کا تابوت نظر آنے لگا۔ دو سال سے زیادہ عرصے سے خاک کا پیوند ہونے کے باوجود تابوت بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اُس پر سے کہنگی و خستگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ سب حاضرین اللہ کی اِس قدرت پر بہت حیران تھے اور مرحومہ کے بارے میں کلماتِ خیر کہتے رہے۔ میں نے یہ واقعہ سن کر ایک اور نتیجہ نکالا: ایک روایتی مشرقی بیوی جس کا ''علیگ'' ہونا ایک اِضافی خوبی تھی، کی طرح سلمیٰ حقی اپنے شوہر کے استقبال کے لیے زندگی بھر ہمیشہ مستعد رہا کرتی تھیں؛ اُنھوں نے اہتمام کی یہ رِیت اور روایت اپنی وفات کے بعد بھی نبھائی اور مرحوم شوہر کی میت کا استقبال کیا۔ محبت اور مشرقیت کا یہ امتزاج اور قیامت کی صبح تک کے لیے یکجائی، ایک نشان و استعارہ بن گئی ہے۔

ایک بار میں نے حقی صاحب کو اِس بات پر بہت داد دی کہ اُنھوں نے اپنے ایک بیٹے کا نام شایان رکھا ہے، کہ اِس طرح وہ اپنا نام مع ولدیت شایانِ شان لکھ سکتے ہیں۔

حقی صاحب نے زندگی کا آخری حصہ اپنی اِکلوتی بیٹی محترمہ تزئینِ جہاں زیبا نظامی کے یہاں کینیڈا میں گزارا۔ وہ فرماتی ہیں کہ حقی صاحب میرا فون لپک کر سنتے تھے۔ حقی صاحب کی وفات کے بعد بھی میں اُنھیں فون

کرتا رہتا ہوں۔ وجہ؟ تعلقِ خاطر کے علاوہ دراصل اُن کی آواز میں اردو سننے کے لیے۔ ایسی اعلیٰ اور شفاف زبان کہ بس وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ اُن کی گفتگو سن کر کلاسیکی اردو کے محاورے ''زبان آبِ کوثر سے دھوئی ہونا'' کا صحیح مطلب سمجھ میں آتا ہے۔

حقی صاحب ایک طرح سے ہمارے گھر کے فرد تھے۔ میرے بچوں کو بلا ناغہ، نام بہ نام سلام و پیار کہا کرتے تھے۔ میرے بچے بھی روزانہ رات کو قرآنِ پاک پڑھنے اور فضائلِ اعمال سے تعلیم کرنے کے بعد اُن کی صحت اور ''اے اللہ! انکل حقی صاحب آپ کے ہاں اِس حالت میں حاضر ہوں کہ آپ اُن سے راضی ہوں'' والی دعا مانگا کرتے تھے۔ اُن کی شیفتگی اور جتنی محبت اُنھوں نے مجھ سے اور میرے بچوں سے کی، کوئی پیمانہ اُس کا ٹانکا ٹوک حساب نہیں کر سکتا۔ اُن کی وفات کی خبر سن کر میری تین سالہ بیٹی بریرہ بھی افسردہ ہوگئی اور مجھ سے تعزیت کرنے لگی۔ حقی صاحب اُس کے لیے اِتنے شناسا تھے کہ وہ کتابوں کے انبار میں سے حقی صاحب کے لغات ڈھونڈ لاتی ہے۔ اُن کا دنیا سے چلے جانا ہمارے گھر کے ایک بزرگ فرد کو کم کر گیا ہے۔ اب میرے بچے اُن کے لیے مغفِرت اور رفعِ درَجات کی دعائیں مانگتے ہیں۔

اپنی صحت کا حال پوچھنے پر حقی صاحب بہت شکر گزار ہوتے تھے۔ فون پر اُنھوں نے کئی بار فرمایا، اور لکھا بھی، کہ وہ بہت خوش قسمت ہیں کہ اُنھیں ایسی محبت کرنے والے اور روزانہ دعا کرنے والے بچے ملے ہیں۔

جب اُن کی آخری بیماری شروع ہوئی اور گردے کے اندر موجود کینسر کا وہ حصہ جو پہلے نادریافت رہ گیا تھا، اچانک سامنے آ گیا اور ڈاکٹروں نے حتمی فیصلہ دے دیا کہ اب آپریشن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تو اُنھوں نے مجھے اِس کی اطلاع کی۔ وہ بہت پرسکون اور مطمئن تھے؛ فرمانے لگے کہ میں پہلے ہی اوسط عمر سے زیادہ جی چکا ہوں۔ پھر فرمایا کہ جگرؔ کا ایک شعر یاد آ رہا ہے: ؎

احباب مجھ سے قطعِ محبت کریں جگرؔ
اب آفتابِ زیست لبِ بام آ گیا

پھر، جب تکلیف بڑھتی گئی تو ایک بار میں نے لکھا کہ:

.....uncle... do you know about a Hadees... it carries words like these that when a person is beloved to Allah, Allah puts hardships, both internal and external, on him so that he becomes free of sins before his time of standing in front of his Creator.....

وہ بہت خوش ہوے اور فرمایا کہ آپ نے میرے علم میں اضافہ کیا۔ چند دن اور گزرے اور ایک بار جب کہ وہ اِس حالت میں تھے کہ اُن کا Holter ٹسٹ ہو رہا تھا (جس میں ۴۸ گھنٹے کے لیے بدن پر مختلف قسم کی تاریں لپٹی ہوتی ہیں)، مجھ سے chatting کرتے ہوے اُنھوں نے فرمایا کہ کراچی سے میری بہو گزشتہ دو دن سے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں ٹال رہا ہوں کہ بیماری کی تفصیل بتانا بھی تو کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کرتا، اور میں اُسے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اِس موقع پر میں نے اُن سے دعا کے لیے کہا۔ فرمانے لگے کہ یہ وقت تو لوگوں کی دعائیں لینے کا ہے۔ میں نے اُنھیں ایک اور حدیثِ پاک کا مفہوم سنایا کہ:

…..I have one more very rare Hadees... On the Day of Judgment Allah will ask a person: O' son of Adam! I was sick. You didn't come to enquire after my health. The person will reply in great astonishment: O' Allah! How that I could enquire after Your health since You are the Sustainer of all that exists. Allah will reply: Didn't you know that thus and thus of my slave was ill. If you'd have visited him and did enquire after his health, you'd have find Me over there. The same did Allah Almighty repeat for hunger & thirst, and same were the answers….

اِس پر اُنھوں نے مجھے بہت دعائیں دیں اور فرمایا کہ یہ حدیثِ پاک میں نے پہلے واقعی نہیں سنی، اور بہت خوشی کا اظہار کیا۔ پھر لکھا کہ:

.....I am lucky to have friends and well wishers, like you, who care for me and are solicitous about my health. This is indeed a blessing and I feel so indebted to you.....

.....Thank you for your care and concern about me and my health. That is indeed kind and thoughtful of you. You are a nice man. Your affections and concern about me are precious gifts of God…..

یہ اُن سے میری آخری بار chatting پر بات تھی۔ فون پر گفتگو البتہ بعد میں بھی کئی مرتبہ ہوئی، جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ وہ اِن دنوں میں ایک خاص کیفیت کے ساتھ یہ شعر بار بار پڑھتے رہے: ؎

پاؤں لگنے لگے ہیں مٹی پر
کم ہوئی پانیوں کی گہرائی

حقی صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جن کی بزرگی بہ سال نہیں ہوا کرتی کہ چند کپڑے زیادہ پھاڑے ہوے ہوں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی شروع ہی میں ایک مقامِ بلند کو پالے اور پھر اُس مقام سے گر جانے یا کم سے کم اُسی پر خود کو برقرار رکھ لینے کے بجاے آگے سے آگے چلتا چلا جاے۔ حقی صاحب بھی ایسے ہی نایاب لوگوں میں سے تھے، اور خود پر افادہ و استفادہ کا دروازہ بند نہ کرنے کی وجہ سے زندگی کے آخری ایام تک اہم ترین کاموں میں جتے رہے۔ وہ معروف معنوں میں کوئی جائیداد چھوڑ کر نہیں گئے لیکن اپنے ادبی ولغوی کارناموں کی شکل میں پوری دنیاے اردو کے لیے وہ نقش چھوڑ کر گئے ہیں جو خونِ جگر کے بغیر ناتمام رہتے ہیں۔

حقی صاحب اب ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کے کاموں سے ہماری نسلیں بھی فائدہ اُٹھاتی رہیں گی۔

☆

حقی صاحب کی وفات سے علم وادب کے قومی منظر نامے میں ایک طویل تعطل اور ایک بسیط خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اگر اُن کے اپنے الفاظ استعمال کیے جائیں تو یوں کہا جاے گا کہ اُن کے چلے جانے سے ادب کے قومی نشریاتی رابطے میں خلل پیدا ہو جانے کی وجہ سے آواز تو آ رہی ہے: ؎

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنّا تھی کہ چاہے جاتے

لیکن تصویر غائب ہو گئی ہے۔

اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆

(تکمیل: ۳/ دسمبر ۲۰۰۵ء؛ نظرِ ثانی اور چند اِضافے: ۲/ نومبر ۲۰۰۶ء)

یہ مقالہ محترم ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب کے حکم پر لکھا گیا؛ اِس کی تیاری میں مدد دینے پر میں کیپٹن شایان الحق حقی اور سید محمد ذوالکفل بخاری کے علاوہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر فتح محمد ملک اور عزیزی محمد ناصر جاوید (ایگزیکٹو ڈائریکٹر مشفق خواجہ لائبریری کراچی) کا بالخصوص شکر گزار ہوں۔

☆☆☆

مآخذ:

الف: کتب

۱۔ لسانی مسائل ولطائف ،مجموعۂ مضامین،شان الحق حقی،مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد

۲۔ نقد ونگارش ،تنقیدی مضامین،شان الحق حقی،مکتبۂ اسلوب،کراچی

۳۔ نکتۂ راز ،تنقیدی مضامین،شان الحق حقی،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی

۴۔ حرفِ دل رس ،مجموعۂ کلام،شان الحق حقی،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی

۵۔ نذرِ خسرو،مجموعۂ کلام،شان الحق حقی،پاکستان رائیٹرز کوآپریٹو سوسائٹی،لاہور

۶۔ قطعاتِ تاریخ ،مجموعۂ تواریخِ وفات،شان الحق حقی،ادارۂ تصنیف وتحقیق،کراچی

۷۔ کتبِ لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ ،حواشی وتعلیقات از شان الحق حقی،مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد

۸۔ نوک جھوک ،مجموعۂ مضامین،شان الحق حقی،فیروز سنز لمیٹیڈ،کراچی

۹۔ جامع الامثال ،وارث سرہندی،نظرِ ثانی از شان الحق حقی،مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد

۱۰۔ گلدستۂ نگارش ،اشاعتِ اوّل،مرتّبہ:محترمہ سلمیٰ حقی،ایجوکیشنل پریس،کراچی

۱۱۔ گلدستۂ نگارش ،اشاعتِ ثانی،مرتّبہ مرزا نسیم بیگ،یونائیٹڈ ایڈورٹائزرز اینڈ آرٹ کولیکٹرز،کراچی

۱۲۔ شہیدانِ وفا کا خوں بہا کیا ،مقالہ از محترمہ سلمیٰ حقی،ادارۂ عصرِ نو،کراچی

۱۳۔ تنقید کی آزادی ،مجموعۂ مضامین،مظفر علی سید،دستاویز پبلیکیشنز،لاہور

۱۴۔ تحسینیات ،مجموعۂ مضامین،عابد صدیق،مغربی پاکستان اردو اکادمی،لاہور

۱۵۔ مغرب میں آزاد نظم اور اُس کے مباحث ،مجموعۂ مضامین،عابد صدیق،اردو اکادمی،بہاول پور

۱۶۔ اِک محشرِ خیال ،افتخار احمد عدنی،پاکستان رائیٹرز کوآپریٹو سوسائٹی،لاہور

۱۷۔ اقبال کا اردو کلام-زبان وبیان کے چند مباحث ،ڈاکٹر ایوب صابر،مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد

۱۸۔ آسان کلیاتِ اقبال ،مرتّبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی،الحمرا پبلشنگ،اسلام آباد

۱۹۔ امکان ،مجموعۂ کلام،ڈاکٹر خورشید رضوی،الحمد پبلیکیشنز،لاہور

۲۰۔ پانی میں ماہتاب ،مجموعۂ کلام،عابد صدیق،الحمد پبلیکیشنز،لاہور

۲۱۔ پرتو روہیلہ:شاعری اور شخصیت ،مجموعۂ مضامین،فیروز سنز،لاہور

۲۲۔ جبینِ نیاز ،مجموعۂ کلام،عابدہ کرامت غوری،ویلکم بک پورٹ،کراچی

۲۳۔ اشاریۂ اردونامہ، مرتّبہ مصباح العثمان، اردو لغت بورڈ، کراچی

۲۴۔ اِملا ور موزِ اوقاف کے مسائل، مرتّبہ اعجاز راہی، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد

۲۵۔ کشاف اصطلاحاتِ لسانیات، ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد

۲۶۔ پنجاب میں اردو، حافظ محمود خاں شیرانی، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور

۲۷۔ صحیح مسلم شریف، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ، رقم الحدیث ۴۶۶۱، کتاب البر والصلۃ والآداب

ب: ادبی و تحقیقی مجلّات/ اخبارات

۱۔ سہ ماہی اردونامہ، ترقیِ اردو بورڈ کراچی، مختلف شمارے

۲۔ سہ ماہی الزبیر، بہاول پور، ''انتقادیات نمبر''، ''شہاب دہلوی نمبر''، اور دیگر چند شمارے

۳۔ ماہنامہ اخبارِ اردو، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد، مختلف شمارے

۴۔ ماہنامہ تہذیب، کراچی، بابت ماہ نومبر ۲۰۰۵ء

۵۔ ماہنامہ ساقی، انڈیا، بابت ماہ اگست ۱۹۴۵ء

۶۔ ماہنامہ شاعر، انڈیا، بابت ماہ ستمبر ۲۰۰۵ء

۷۔ ماہنامہ قومی زبان، کراچی، مختلف شمارے

۸۔ روزنامہ ڈان، کراچی، مؤرخہ ۲۲/ اکتوبر ۲۰۰۵ء

ج: انگریزی کتب اور مآخذ

1. The Cambridge Encyclopedia of The English Language, by David Crystal, The Cambridge University Press, 1995
2. English translation of the Tractacus Logico-Philosophicus, by Ludwig Wittgenstein from www.bartleby.com
3. Language Planning in Pakistan: A case study of Pakistan, by Sabiha Mansoor, Oxford University Press, Pakistan
4. The Story of the Nations: GOTHS- (Goths from the Earliest Times to the End of the Gothic Dominion in Spain), by Henry Bradley, G P Putnam's Sons, 1883.
5. Shakespeare's Imagery and What It Tells Us, by Caroline Spurgeon, The Cambridge University Press, 1935.

د:متفرقات

ا۔اردواورانگریزی کے مختلف لغات،اور اِن میں سے کچھ کے اِبتدائیے
۲۔کیپٹن شایان الحق حقی صاحب کے عنایت کردہ اپنے والدِ محترم اورخاندان کے بڑوں کے چنداہم اورنادرخطوط

ہ: کتب خانے

ا۔مشفق خواجہ لائبریری،کراچی(ناصرجاویدصاحب) ۲۔بیدل لائبریری،کراچی ۳۔دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری،لاہور
۴۔مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد ۵۔نیشنل لائبریری آف پاکستان،اسلام آباد

و:انٹرنیٹ(صرف دومنتخب سائٹس)

1. http://en.wikipedia.org/wiki/Shan-ul-Haq_Haqqee
2. http://desiradiocanada.com/DRC%20 Specials/1-shaan-ul-haqqi%20ki%20yaad%20main.mp3